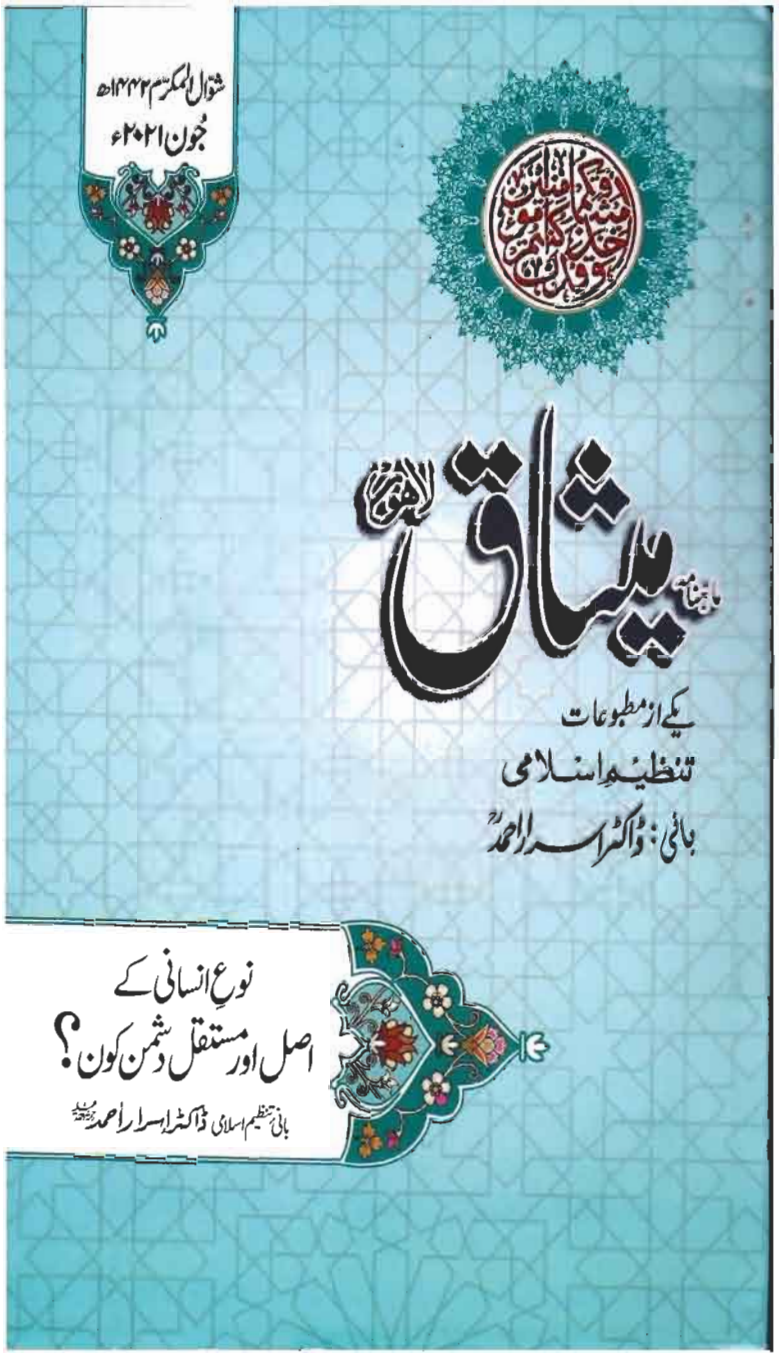

شوال المکرم ۱۴۴۲ھ
جون ۲۰۲۱ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نوعِ انسانی کے اصل اور مستقل دشمن کون؟

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جاری کردہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ
بانی تنظیم اسلامی

تنظیم اسلامی

زیرِ سرپرستی شجاع الدین شیخ حفظہ اللہ
امیر تنظیم اسلامی

رجوع الی القرآن کورس

دورانیہ : 9 ماہ

نصاب

1 عربی گرامر (صرف و نحو)
2 ترجمہ و ترکیب قرآن (مع تفسیری توضیحات)
3 تجوید و ناظرہ
4 قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی
5 فکرِ اسلامی
6 حدیث و اصطلاحات حدیث
7 بنیادی فقہی مسائل
8 سیرت النبی ﷺ
9 خصوصی محاضرات

Online رجسٹریشن جاری ہے
tanzeem.org/activities/education/ruju-ilal-quran/

انٹرویو
11 جون 2021ء صبح 08:00 بجے

ایام تدریس
پیر تا جمعہ

ان شاء اللہ
کلاسز کا آغاز 14 جون 2021ء

اوقات تدریس
صبح 8:15 تا 01:00 بجے

رابطہ: 0334-5632242 (مبشر عارف)
(042)35473375-78

• بیرون لاہور رہائش رکھنے والوں کے لئے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے

دارُ الاِسلام مرکز تنظیمِ اسلامی
23KM ملتان روڈ چوہنگ لاہور
ای میل: riqc@tanzeem.org
ویب: www.tanzeem.org

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 70

شمارہ : 6

شوال المکرّم 1442ھ

جون 2021ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِتعاون: 400 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:
ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی مُعاوِن:
حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس:35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ''دارُالاسلام'' ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— 5

مغضوبین اور ضالین کا ناپاک گٹھ جوڑ

ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ——— 11

سورۃ القمر (مکمل)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ ——— 29

نوعِ انسانی کے اصل اور مستقل دشمن کون؟

ڈاکٹر اسرار احمد

حقیقتِ دین ——— 81

الحاد و تشکیک

انسان کی فکری اور عملی گمراہیاں

راحیل گوہر

انوارِ ہدایت ——— 94

اسلامی تعلیمات میں اخلاق کی اہمیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مَغۡضُوۡبِین اور ضَالِّین کا ناپاک گٹھ جوڑ

فلسطین کی مقدّس سرزمین کے حوالے سے موجودہ صہیونیوں اور عیسائیوں کے درمیان ناپاک گٹھ جوڑ وجود میں آچکا ہے۔ صہیونی ریاست اسرائیل‘ نہتے اور بے گناہ فلسطینیوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے اور امریکہ و یورپ کی عیسائی ریاستیں اسرائیل کی پشت پر دیوار بنے کھڑی ہیں۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اسرائیل کی ریاستی دہشت گردی اور یک طرفہ خون ریزی کو یورپ اور امریکہ کا عیسائی میڈیا دو فریقوں کے درمیان لڑائی قرار دے رہا ہے اور اسرائیل کے حقِ دفاع کی بات بڑے زور دار انداز میں کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ یک طرفہ طور پر عورتوں اور بچوں سمیت فلسطینیوں کا قتلِ عام ہے۔ امریکہ سلامتی کونسل کی قیامِ امن کی قراردادوں کو مسلسل ویٹو کر کے جان بوجھ کر اسرائیل کو زیادہ سے زیادہ فلسطینیوں کو تہِ تیغ کرنے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ اسرائیل کی اِس غنڈہ گردی اور عیسائی دنیا کی فراہم کردہ اِس اعانت کا تفصیلی ذکر کرنے سے پہلے ہم ارضِ فلسطین کی مختصر تاریخ قارئین کے سامنے رکھنے کی کوشش کریں گے۔

اللہ ربّ العزت نے تو ارضِ فلسطین دین کے قیام اور شریعت کے نفاذ کے لیے سارے جہان پر فضیلت کے وعدہ کے ساتھ ’’اُمّتِ اوّل‘‘ یعنی بنی اسرائیل کے لیے لکھ دی تھی‘ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے انتہائی مایوس کُن اور افسوسناک جواب کے بعد یہ مقدّس سرزمین اُن پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی۔ اس کے بعد انہیں توبہ اور حضرت طالوت کے ہمراہ قتال کے بعد اپنے وعدہ کے عین مطابق پہلے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی سلیمانی سلطنت اور ہیکل سلیمانی کی تعمیرِ اوّل کی شکل میں عروج حاصل ہوا‘ لیکن بعد ازاں بنی اسرائیل تحریفِ کتاب‘ پھر بعض انبیاءؑ کے انکار اور بعض کے قتل جیسے جرائم میں ملوث ہونے کے نتیجے میں بخت نصر کے ہاتھوں بدترین ذلت سے دوچار ہوئے اور اپنے ہیکل کی بے حرمتی کے ساتھ اس مقدّس سرزمین سے بھی بے دخل کر دیے گئے۔ پھر حضرت عزیر علیہ السلام کے دورِ نبوت میں احیائی کوششوں کے نتیجے میں مکابی سلطنت

اور ہیکل سلیمانی کی تعمیرِ ثانی کی شکل میں دوسرا عروج حاصل ہوا۔ لیکن اُن کے اخلاقی و عملی زوال کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے ’’معجزاتی پیغمبر اور مبشّرِ رسولِ آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اقدامِ قتل‘‘ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؑ کے رفع آسمانی اور یہودیوں کے انتشارِ زمینی کا فیصلہ کیا اور بحیثیت اُمّت ان کی مہلت ختم ہوگئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ’’پیروکاروں‘‘ کو یوم قیامت تک اِن ’’کافروں‘‘ پر غلبہ کا فیصلہ فرما دیا گیا اور اللہ کی وحدانیت کی شہادت اور رسولوں کی نصرت کی ذِمّہ داری ’’نصاریٰ‘‘ کے کندھوں پر آ گئی۔

۷۰ء میں مشرک رومیوں کے ہاتھوں ان یہودیوں کی ایک بار پھر تاریخی پٹائی ہوئی اور یروشلم شہر اور ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا گیا۔ دوسری صدی عیسوی میں رومن شہنشاہ ہیڈرسن نے یروشلم شہر دوبارہ تعمیر کیا تو اس کا نام بھی یروشلم نہیں ’’ایلیا‘‘ رکھا اور اس کے حکم پر یہاں یہودیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اور پھر اگرچہ تقریباً تین سو سال تک عیسائی مُوَحِّدوں نے مصائب برداشت کیے‘ لیکن بعد ازاں ’’یورشِ تاتار‘‘ کی طرح رومن سلطنت نے خود عیسائیت قبول کر لی اور یوں ’’اپنے سے قبل کے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے ماننے والے‘‘ اس مقدّس سرزمین کے متولی بنا دیے گئے۔ اور عیسائیوں نے ہیکل کے مغربی حصہ‘ جو کہ یہود کا قبلہ تھا‘ کے برعکس ہیکل کے مشرقی حصہ‘ جس میں حضرت مریم سلام علیہا معتکف رہی تھیں‘ کو اپنا قبلہ قرار دے کر کلیسائے قمامہ اور کلیسائے قسطنطنیہ جیسے عیسائی مقدّس مقامات بھی تعمیر کیے۔ اور اپنے رسول عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی پاک والدہ مریمؑ پر بہتان باندھنے والے کافر یہودیوں کے داخلہ کی ممانعت کو برقرار رکھا۔

لیکن جب عیسائیوں نے بھی اپنے رسول کو خدا کا بیٹا قرار دے کر بدترین شرک کا ارتکاب کیا‘ دین میں تحریف کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بطورِ کفارہ صلیب پر چڑھ کر شریعت کو ساقط کرنے کا جھوٹا عقیدہ گھڑ کر دین و شریعت کو مذاق بنا دیا اور انسانیت کو راہ دکھانے کی بجائے ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر پوری طرح اندھیرے میں ڈبو دیا تو اللہ تعالیٰ نے خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آفتابِ رسالت بنا کر بنی اسماعیلؑ میں مبعوث فرما دیا اور ’’رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم‘‘ بنا کر تا قیامِ قیامت ’’تمام نوعِ انسانی پر اتمامِ نعمتِ ہدایت کا وعدہ‘‘ اور ’’پورے کُرّۂ ارضی کے تمام ادیان پر غلبہ دینِ حق کا مشن‘‘ دے کر بھیج دیا۔ اور یہ بھی ایک خوشگوار تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ۶۲۲ عیسوی میں ہونے والی عظیم ہجرتِ مدینہ کے محض آٹھ سال کے اندر ۶۳۰ عیسوی میں

اس قدیم گھر یعنی مسجد الحرام والی مقدّس سرزمینِ مکہ کی فتح نصیب فرمائی اور ٹھیک آٹھ سال بعد ہی ۶۳۸ عیسوی میں اس مسجد اقصیٰ کی تولیت بھی امام الانبیاء ورحمۃٌ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ماننے والوں کے سپرد کر دی جہاں وہ اپنے بندے حضرت محمد ﷺ کو راتوں رات تمام انبیاءؑ کی امامت اور تمام عالمین کی سیاحت کے لیے لے گیا تھا۔

جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فاتح کی حیثیت سے یروشلم میں داخل ہوئے تو عیسائیوں کی طرف سے عائد شرائط میں ایک اہم شرط یہودیوں کے داخلے کی ممانعت کو برقرار رکھنے کی تھی' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود اُن کے قبلہ کی جگہ کا تعین کروا کر جہاں عیسائیوں نے اظہارِ نفرت کے طور پر گندگی کے ڈھیر لگائے ہوئے تھے' اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کی صفائی کی اور انہیں عبادت کے لیے داخلہ کی اجازت بھی دے دی۔ اور معاہدہ کے مطابق یہود کو وہاں بسنے کی عمومی ممانعت انتظامی طور پر برقرار رکھی۔ پھر آپؓ عیسائیوں کے کلیسا میں گئے تو ان کی پیشکش کے باوجود آپؓ نے باہر آ کر بیت المقدس کی جنوبی دیوار کے قریب جگہ کو نماز کے لیے مختص کیا' جہاں بعد میں مسجد عمر رضی اللہ عنہ تعمیر کی گئی' جو کہ ہیکل کی چار دیواری کے اندر تو ہے لیکن اصل عمارت سے ہٹ کر ہے۔

یوں اسلام نے تاریخ میں پہلی مرتبہ مسجدِ اقصیٰ جس کے ماحول کو ہی اللہ تعالیٰ نے بابرکت قرار دیا ہے' کے بارے میں یہ سنہری اصول طے کیا کہ اگرچہ یہود کو احاطہ ہیکل میں اور عیسائیوں کو اُن کے مقدّس مقامات میں اپنی اپنی عبادت کی اجازت رہے گی' لیکن ان کی اس آزادی کو برقرار رکھنے اور دوسرے کی آزادی میں مخل ہونے سے روکنے کی ذِمہ داری ''تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کے ماننے والے' زمین پر اللہ کی خلافت اور عدل وانصاف کی گواہی کے ذِمہ دار گروہ'' یعنی اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی رہی' جس کو ایک عرصے تک تمام خلفائے اُمّت نے بہترین انداز میں نبھایا۔

تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ آخری' بہترین اور عالمگیر اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے جس جس گروہ نے جب جب توحید' دینِ محمدی ﷺ' عدل و انصاف اور خلافت کی ذمہ داری کو نبھانے کا بیڑا اٹھایا' اللہ تعالیٰ نے اسے اس مسجد کی تولیت کے شرف سے نوازا' خواہ وہ شروع کے اموی وعباسی خلفاء ہوں یا بعد کے ایوبی وعثمانی۔ اور جب جب جس جس نے دین سے اپنا رخ پھیرا' اللہ تعالیٰ نے ''حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ'' کے مصداق سابقہ اُمّت یعنی یہود کی طرح اُس کی پٹائی بھی اسی سرزمین کے گرد کروائی' خواہ وہ تاتاریوں کے گھوڑوں کے پاؤں تلے آخری عباسی

خلیفہ کو روندے جانے کی شکل میں ہو' یا پھر یورپی استعماری اقوام کے ہاتھوں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کی شکل میں۔

درحقیقت آج بہت سے لوگوں کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ جھگڑا ہے کیا؟ جھگڑا یہ ہے کہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد اُس مغضوب علیہم قوم کے بھی انتہائی مغضوب ترین حصہ یعنی صہیونیوں نے یورپ کو اپنی گرفت میں لے کر بالفور ڈیکلیریشن منظور کروایا اور یورپ نے "A land without a people for a people without a land" کے جھوٹے نعرے کے تحت یہود کو دنیا بھر سے لا لا کر فلسطین میں آباد کیا' انھیں مسلح جتھوں کی صورت میں منظم کیا' فلسطینیوں پر مظالم کرائے' ان کی زمینوں پر قبضے کرائے۔ یورپ نے یہ تاثر دیا کہ ہم ایک ایسی قوم کو جس کے پاس زمین نہیں ایک ایسی زمین پر آباد کرنے جا رہے ہیں جس کے پاس کوئی قوم نہیں۔ فرانس کے سابق ڈپٹی سپیکر اور سینیٹر راجر گراڈی کی کتاب ''دی فاؤنڈنگ متھز آف اسرائیلی پالیسی'' پڑھیے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس تاثر کو ثابت کرنے کے لیے کہ فلسطین میں کوئی قوم نہیں رہتی' کتنے گاؤں' کتنے کنویں اور کتنے قبرستان بلڈوز کیے گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ فلسطینیوں کی دیہی آبادی کی یادداشت محو کرنے کے لیے اور ''متروک شدہ ملک'' کے افسانے کو حقیقی رنگ دینے کے لیے عرب گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیے گئے اور بیسویں صدی کے وسط میں یورپ کی استعماری اقوام نے جب اپنا استعماری بستر لپیٹنا شروع کیا تو اپنے ناجائز بچے کے طور پر ۱۹۴۸ء میں ''اسرائیل'' نامی ریاست چھوڑ گئے' جس نے ۱۹۶۷ء میں جنگ کے ذریعے اپنا حجم کئی گنا بڑھا لیا۔ اور پھر کبھی عراق پر حملہ اور کبھی داعش کے نتیجے میں شام کی تباہی۔ الغرض صہیونی اور WASP (White Anglo-Saxon Protestants) مل کر طے کر چکے ہیں کہ جلد از جلد ایک بڑی جنگ کے نتیجے میں ''گریٹر اسرائیل'' کا قیام عمل میں لایا جائے۔

امسال رمضان کی پچیسویں شب کو پھر سے خون کی ہولی کھیلنا شروع کر دی گئی۔ عورتوں' بچوں اور جوانوں کے خون سے فلسطین کی سرزمین رنگین ہو رہی ہے۔ درجنوں جہاز شہری بستیوں پر بم گرا رہے ہیں۔ شیطنت ننگا ناچ ناچ رہی ہے۔ جنگل کا درندہ بھی جب سیر ہو جاتا ہے تو شکار کی طرف سر اُٹھا کر نہیں دیکھتا' لیکن صہیونیوں کے منہ کو جو فلسطینیوں کا خون لگا ہے' اُس سے اُن کی پیاس مِٹ نہیں رہی بلکہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ عوامی سطح پر ہر صاحبِ ایمان ''مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْجَسَدِ'' کے مصداق اس درد کو محسوس کر رہا ہے۔ اور اس میں بھی عجیب بات ہے کہ ''اُمّیّین'' یعنی عرب کی بجائے ''آخَرین'' یعنی عجم کے دو عظیم خطوں کے مسلمان پیش پیش ہیں۔ ایک اُس ترکی کا مسلمان جو خلافت کا علمبردار ہوتے ہوئے ماضی قریب میں اپنے تمام قرضوں کی معافی کی پیشکش کو ٹھکرا کر فلسطین کی حفاظت میں ڈٹ گیا تھا' اور دوسرا برعظیم پاک و ہند کا وہ مسلمان جو کبھی اپنا پیٹ کاٹ کر امداد بھیج کر اور کبھی جان ہتھیلی پر رکھ کر پُرزور تحریک چلا کر خلافت کی حفاظت میں ڈٹ گیا تھا۔ اور آج بھی بطور ریاست معیشت کی بہتری کی لالچ کے باوجود اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے راضی نہیں۔

اب جہاں تک اس مسئلہ کے حل کا تعلق ہے تو یہ بات تو بہت ٹھیک کہی جا رہی ہے کہ ''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے'' لہٰذا صرف مذمتی بیانات' قراردادوں اور ''اقوام متحدہ'' میں جنیوا کانفرنسوں کے حوالے سے دہائی دینے کے بارے میں تو علّامہ اقبال ''فلسطینی عرب سے'' مخاطب ہو کر کہہ چکے ہیں کہ ؎

تری دوا نہ جنیوا میں ہے' نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!

قرآن وسیرت کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ کی راہ میں یعنی اللہ کے کلمے کی سربلندی' عدل وانصاف کے قیام اور ظلم وستم کے خاتمے اور مظلومین کی حمایت میں جنگ کرنا انسان کو اللہ کا بے حد محبوب بندہ بنا دیتا ہے' لیکن یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ جنگ اکیلے اکیلے مسلمان ممالک کے کرنے کا کام نہیں بلکہ مل جل کر ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح منظم ہو کر کرنے کا کام ہے (الصّف:۴)۔ تو جس طرح ایک ملک یا ملک کے کسی خطے میں اللہ کی راہ میں جنگ کی نوبت آئے تو وہاں کے مؤمنین کو مل جل کر یہ کام کرنا ہوتا ہے' اسی طرح اگر بین الاقوامی سطح پر سفارتی' سیاسی اور معاشی محاذ آرائی سے آگے بڑھتے ہوئے جنگ کی نوبت آ جائے' جو کہ ہمارے نزدیک آج نہیں تو کل آ ہی پہنچی ہے' تو یہ کام بھی مختلف مسلم ممالک کو مل جل کر ہی کرنا ہوگا۔ لہٰذا ان ممالک کے مخلص مؤمنین کو بھی چاہیے کہ اپنی حکومتوں پر اس حوالے سے دباؤ ڈالیں۔ گویا اس مسئلہ کا ایک فوری اور عارضی حل تو یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک بالخصوص وہ ممالک جو دفاعی' معاشی اور جغرافیائی لحاظ سے اہم تر ہیں' ع ''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے

لیے'' کے مصداق اپنے اختلافات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے مل جل کر فوری اور بھرپور سفارتی' معاشی' اور سیاسی دباؤ ڈالیں اور پھر بالکل فطری طریق پر اس سے آگے بڑھتے ہوئے مسلّح تصادم سے بھی دریغ نہ کریں۔ اور یاد رکھیں کہ ع ''ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر!''

لیکن درحقیقت مستقل اور دیرپا حل تو صرف ایک ہی ہے اور قرآن اس حوالے سے سورۃ الاعراف' آیت ۱۵۷ میں ہماری رہنمائی فرماتا ہے' جس میں اللہ تعالیٰ نے خود بنی اسرائیل سمیت پوری نوعِ انسانی کی فلاح وکامرانی کو نبی اُمّی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے' تعظیم بجا لانے' دین کے عالمی غلبہ اور عالمی خلافت کے قیام کے مشن میں نصرت دینے اور آپ ﷺ پر نازل شدہ قرآن کے اتباع کرنے سے مشروط کر رکھا ہے۔ گویا ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا' لوح وقلم تیرے ہیں!

گویا مسلمان ممالک کو ایک بار پھر ایک ہی لڑی میں پرونے کی ضرورت ہے۔ نیشن سٹیٹس کی بجائے اُمّتِ مُسلمہ حقیقتاً معرضِ وجود میں آئے' یعنی ایک مرکزی نظامِ خلافت قائم کرنے کی ضرورت ہے' قرآن کریم جس کا امام ہو اور حدیث رسول ﷺ جس کا اوڑھنا بچھونا ہو۔ یہی مستقل اور اَبدی حل ہے ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر اُستوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر!

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب
اشاعت خاص: 60 روپے اشاعت عام: 30 روپے

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْقَمَر

آیات ۱ تا ۸

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَ انۡشَقَّ الۡقَمَرُ ﴿۱﴾ وَ اِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَ یَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ﴿۲﴾ وَ کَذَّبُوۡا وَ اتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ ؕ وَ کُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ ﴿۳﴾ وَ لَقَدۡ جَآءَہُمۡ مِّنَ الۡاَنۡۢبَآءِ مَا فِیۡہِ مُزۡدَجَرٌ ۙ﴿۴﴾ حِکۡمَۃٌۢ بَالِغَۃٌ ۫ فَمَا تُغۡنِ النُّذُرُ ۙ﴿۵﴾ فَتَوَلَّ عَنۡہُمۡ ؕ یَوۡمَ یَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیۡءٍ نُّکُرٍ ۙ﴿۶﴾ خُشَّعًا اَبۡصَارُہُمۡ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ کَاَنَّہُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ۙ﴿۷﴾ مُّہۡطِعِیۡنَ اِلَی الدَّاعِ ؕ یَقُوۡلُ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا یَوۡمٌ عَسِرٌ ﴿۸﴾

آیت ۱ ﴿اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ ﴿۱﴾﴾ ’’قیامت کی گھڑی قریب آچکی اور چاند شق ہو گیا۔‘‘

جیسا کہ قبل ازیں بھی کئی بار ذکر ہو چکا ہے کہ قیامت کی نشانیوں میں سب سے قطعی اور یقینی نشانی حضور ﷺ کی بعثت ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَۃُ کَھَاتَیْنِ))[1] ’’مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح (جڑا ہوا) بھیجا گیا ہے‘‘۔

۱۔ صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب قول النبی ﷺ بعثت انا والساعۃ کھاتین۔ ح:۶۵۰۴ و ۶۵۰۵۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الفتن واشراط الساعۃ‘ باب قرب الساعۃ‘ ح:۸۶۷ و ۲۹۵۱۔

اس لحاظ سے اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ کا مفہوم یہ ہے کہ اب جبکہ آخری رسولؐ بھی دنیا میں آ چکے ہیں تو سمجھ لو کہ قیامت کا وقت بہت قریب آ لگا ہے۔ سورۃ السجدۃ کی آیت ۵ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک دن ہمارے ہزار برس کے برابر ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حضور ﷺ کے وصال کو ابھی صرف ڈیڑھ دن ہی ہوا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اب قیامت بالکل سامنے ہے۔ حضرت اسرافیلؑ اپنے منہ کے ساتھ صور لگائے بالکل تیار کھڑے ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اشارے کی دیر ہے۔ جونہی اشارہ ہوگا وہ صور میں پھونک مار دیں گے۔ قربِ قیامت کے اس مفہوم کو سورۃ المعارج میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿اِنَّہُمۡ یَرَوۡنَہٗ بَعِیۡدًا ﴿۶﴾ وَّنَرٰىہُ قَرِیۡبًا ﴿۷﴾﴾ ’’یہ لوگ تو قیامت کو بہت دُور سمجھ رہے ہیں‘ جبکہ ہم اسے بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔‘‘

آیت میں چاند کے پھٹنے کا ذکر ایک خرقِ عادت واقعہ کے طور پر ہوا ہے۔ روایات کے مطابق اُس وقت حضور ﷺ منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ چاند کی چودھویں رات تھی۔ آپؐ کے اردگرد ہر طرح کے لوگ تھے۔ کسی نے کہا کہ آپؐ کی طرف سے کوئی نشانی ہونی چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چاند کی طرف دیکھو۔ لوگوں کو متوجہ کر کے آپ ﷺ نے انگلی کا اشارہ کیا اور چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں ٹکڑے قریب آ کر دوبارہ جڑ گئے۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: دیکھو اور گواہ رہو! کفار نے کہا کہ محمد (ﷺ) نے ہم پر جادو کر دیا تھا‘ اس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکہ کھایا۔ بعد میں باہر سے آنے والے لوگوں نے بھی اس کی شہادت دی۔ میرے نزدیک یہ معجزہ نہیں تھا بلکہ ایک ’’خرقِ عادت‘‘ واقعہ تھا۔ اس نکتے کی وضاحت اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کی جا چکی ہے کہ ہر رسول کو ایک معجزہ دیا گیا جو باقاعدہ دعوے کے ساتھ دکھایا گیا۔ اس لحاظ سے حضور ﷺ کا معجزہ قرآن ہے۔ البتہ خرقِ عادت واقعات حضور ﷺ سے بے شمار نقل ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے اگر اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے تو حضور ﷺ کی کرامات تو ہزار گنا بڑی ہوں گی۔

اس واقعہ پر بہت سے اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔ اس بنیاد پر بھی کہ اس سے متعلق دنیا میں کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ اسی لیے سرسید احمد خان مرحوم اور ان کے مکتبہ فکر کے لوگوں نے

آیت کے متعلقہ الفاظ کی مختلف تاویلات کی ہیں۔ بہرحال جہاں تک تاریخی ثبوت نہ ہونے کا تعلق ہے اس بارے میں یہ حقیقت بھی مدِنظر رہنی چاہیے کہ یہ واقعہ رونما ہونے کے وقت آدھی دنیا میں تو دن کی روشنی ہوگی۔ لیکن جن علاقوں میں چاند دیکھا جاسکتا تھا ان علاقوں کے لوگ بھی تو ظاہر ہے اس وقت ٹکٹکی باندھے چاند کو نہیں دیکھ رہے تھے کہ ان میں سے اکثر اس واقعے کے عینی شاہد بن جاتے۔ پھر یہ منظر بھی صرف لمحے بھر کا تھا اور اس دوران چاند کی روشنی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا کہ لوگ چونک کر دیکھتے۔ البتہ ایک تاریخی روایت کے مطابق برصغیر میں مالابار کے ساحلی علاقے کے ایک ہندو راجہ نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بعد میں جب عرب تاجروں کے ذریعے اُس تک اسلام کی دعوت اور قرآنی تعلیمات پہنچیں تو اُس نے نہ صرف ایک چشم دید گواہ کے طور پر اس واقعہ کی تصدیق کی بلکہ وہ ایمان بھی لے آیا۔ واللہ اعلم!

آیت ۲ ﴿وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝۲﴾ ''اور اگر وہ دیکھیں گے کوئی نشانی تب بھی وہ اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔''

آیت ۳ ﴿وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ﴾ ''اور انہوں نے تکذیب کی اور اپنی خواہشات کی پیروی کی''

﴿وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳﴾ ''اور (اللہ کا) ہر امر ایک وقتِ معیّن کے لیے قرار پاچکا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی منصوبہ بندی میں ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ کوئی کام اللہ کے طے شدہ وقت سے نہ تو پہلے انجام پاسکتا ہے اور نہ ہی اس سے مؤخر ہوسکتا ہے۔ انسان کا کام ہے کہ وہ کوشش کرتا رہے اور نتائج اللہ پر چھوڑ دے۔ جیسے یہ طے شدہ امر ہے کہ اللہ کے دین کا غلبہ دنیا میں ہوکر رہے گا' مگر اللہ کی مشیت میں اس کے لیے کون سا وقت مقرر ہے ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ ہم اقامتِ دین کی جدّوجُہد کو فرضِ عین اور اپنی اخروی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس میں اپنا تن من دھن لگانے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہیں۔ سیرتِ نبویؐ سے اس جدّوجُہد کے منہج کو سمجھیں' اس کے آداب سیکھیں' اس کی شرائط معلوم کریں اور پورے خلوصِ نیت کے ساتھ اس کے لیے محنت کریں۔ اس محنت اور جدّوجُہد کے دوران ہمیں

نتائج کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں تو یہ محنت اللہ کی رضا کے لیے کرنی ہے۔ اگر ہماری اس محنت کے نتائج ہماری زندگیوں میں ظاہر نہیں ہوتے تو کوئی پروا نہیں' ہم دین کو غالب کرنے کے مکلّف نہیں' ہم تو صرف اس کے لیے جدّوجُہد کرنے کے مکلّف ہیں۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اللہ کے ذِمّے ہے۔ اگر ہم نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق خلوصِ نیت سے اس راستے میں محنت کی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم ضرور سرخرو ہوں گے۔

اس فلسفے کو اچھی طرح سے نہ سمجھنے کی وجہ سے اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں لوگ غلطیاں کرتے ہیں۔ جب ان کی جدّوجُہد کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آتے تو وہ عجلت اور بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے الٹے سیدھے طریقے اپناتے ہیں۔ ایسی ہی غلطیوں سے تحریکیں غلط راستوں پر چل پڑتی ہیں اور اس وجہ سے دین الٹا بدنام ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ایک بہت اہم نکتہ یہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے دوران غور وفکر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ حضور ﷺ کے بعد اب نہ تو کوئی شخصیت معصوم عن الخطا ہے اور نہ ہی کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست راہنمائی مل سکتی ہے۔ ظاہر ہے اب یہ کام اجتہاد اور غور وفکر سے ہی چلنا ہے اور اجتہاد میں غلطی کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ چنانچہ انفرادی و اجتماعی سطح پر انسانوں سے غلطیاں سرزد ہونے کے امکان کے پیشِ نظر فیصلوں پر نظرِ ثانی کی گنجائش بھی رکھنی چاہیے اور اس کے لیے ذہنی طور پر ہر وقت تیار بھی رہنا چاہیے۔

آیت ۴ ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝۴﴾ ''اور ان کے پاس وہ خبریں آچکی ہیں جن میں تنبیہہ ہے۔''

گزشتہ اقوام کے اپنے پیغمبروں کو جھٹلانے اور پھر اس کے نتیجے میں عذابِ الٰہی کے ذریعے تباہ ہو جانے کی خبریں (انباء الرسل) ان لوگوں کو تفصیل سے بتائی جا چکی ہیں۔ ان خبروں میں مشرکینِ مکّہ کے لیے یقیناً کافی تنبیہہ وتہدید اور سامانِ عبرت موجود ہے۔

آیت ۵ ﴿حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵﴾ ''کامل دانائی (کی باتیں)' لیکن ان خبردار کرنے والوں سے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا۔''

آیت ۶ ﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے صرفِ نظر کر لیجیے۔''

﴿يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝۶﴾ ''جس دن ایک پکارنے والا پکارے

گا ایک بہت ناگوار چیز کی طرف۔‘‘

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے‘ ابتدائی مکّی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں حضور ﷺ کو ملتے جلتے الفاظ میں یہ ہدایت بار بار دی گئی ہے کہ آپؐ صبر کریں‘ آپؐ درگزر سے کام لیں‘ انہیں نظر انداز کر دیں‘ وغیرہ وغیرہ۔

آیت ۷ ﴿خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ﴾ ’’(اُس وقت) ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوں گی۔‘‘

﴿يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۙ﴾ ’’یہ اپنی قبروں سے ایسے نکل کر آئیں گے جیسے ٹڈی دَل پھیلا ہوا ہو۔‘‘

ظاہر ہے ہزاروں سال سے انسان اس زمین میں دفن ہو رہے ہیں اور قیامت تک ان کی تعداد کتنی ہو جائے گی‘ ہم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری فوت ہونے والے انسان تک سب کے سب زمین سے نکل کر ایک ہی سمت دوڑے چلے جا رہے ہوں گے تو وہ ٹڈی دَل کی طرح نظر آئیں گے۔

آیت ۸ ﴿مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ﴾ ’’دوڑتے ہوئے آئیں گے پکارنے والے کی طرف۔‘‘

﴿يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝﴾ ’’کافر کہیں گے کہ یہ تو بڑا سخت دن ہے۔‘‘

ہر شخص کو اپنی قبر سے اٹھتے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے ساتھ کیسا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ جیسا کہ سورۃ القیامہ میں فرمایا گیا: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝﴾ کہ ہر انسان اپنے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ ’’من آنم کہ من دانم!‘‘ چنانچہ کفّار و مشرکین اپنی قبروں سے نکلتے ہی روزِ حشر کی سختیوں کے بارے میں چیخ و پکار شروع کر دیں گے۔

آیات ۹ تا ۱۷

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَ قَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ۝ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى

الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ وَ لَقَدْ تَّرَكْنٰهَاۤ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

آیت ۹ ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ﴾ ’’جھٹلایا تھا ان سے پہلے نوحؑ کی قوم نے‘‘

اب یہاں سے اس سورت میں انباء الرسل کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے‘ سورۃ النجم اور سورۃ القمر کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سورۃ النجم میں ’’تذکیر بآلاء اللہ‘‘ (اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور نعمتوں کے ذریعے تذکیر) کا انداز تھا‘ جبکہ اس سورت میں ’’تذکیر بایام اللہ‘‘ اور انباء الرسل کا تذکرہ ہے۔ بالکل یہی تقسیم اور یہی انداز اس سے پہلے ہم سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف کے مطالعے کے دوران بھی دیکھ چکے ہیں۔ سورۃ الانعام میں آلاء اللہ کے ذریعے تذکیر کی گئی ہے‘ جبکہ سورۃ الاعراف میں انباء الرسل کا انداز ہے۔ اسی طرح یہ دونوں سورتیں بھی مل کر تذکیر و انذار کے دونوں پہلوؤں کی تکمیل کرتی ہیں۔

﴿فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ۝﴾ ’’تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ تو مجنون ہے اور اُسے جھڑک دیا گیا۔‘‘

اس بدبخت قوم نے ہمارے جلیل القدر رسولؑ کو نہ صرف جھٹلا دیا بلکہ اس کے ساتھ اہانت آمیز سلوک روا رکھا۔

آیت ۱۰ ﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝﴾ ’’تو اُس نے پکارا اپنے رب کو کہ میں مغلوب ہو چکا ہوں‘ اب تُو اُن سے انتقام لے۔‘‘

رسولوںؑ کی مدد کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے قانون کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝﴾ ’’اور ہماری یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے اپنے اُن بندوں کے لیے جن کو ہم (رسول بنا کر) بھیجتے رہے ہیں‘ کہ اُن کی لازماً مدد کی جائے گی۔ اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝﴾ ’’تو ہم نے کھول دیے

آسمان کے دروازے اُس پانی کے ساتھ جو مسلسل چھاجوں برستا رہا۔''

آیت ۱۲ ﴿وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا﴾ ''اور ہم نے زمین کو پھاڑ کر چشمے ہی چشمے کر دیا''

اُس وقت اس علاقے کی صورتِ حال یوں تھی کہ آسمان سے مسلسل موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور نیچے زمین سے جا بجا چشمے اس طرح پھوٹ رہے تھے کہ زمین گویا چشموں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

﴿فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝۱۲﴾ ''تو وہ سارا پانی مل گیا ایک ایسے کام کے لیے جس کا فیصلہ ہو چکا تھا۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نافرمان قوم کو غرق کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے مطابق آسمان سے برسنے والے اور زمین سے پھوٹنے والے پانی نے مل کر ایک خوفناک سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔

آیت ۱۳ ﴿وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝۱۳﴾ ''اور ہم نے اُسے سوار کر دیا اُس (کشتی) پر جو تختوں اور کیلوں سے بنی تھی۔''

آیت ۱۴ ﴿تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ﴾ ''جو چل رہی تھی ہماری نگاہوں کے سامنے۔''

وہ کشتی ہماری نگرانی اور حفاظت میں چل رہی تھی۔

﴿جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝۱۴﴾ ''یہ بدلہ تھا اُس شخص کے لیے جس کی ناقدری کی گئی تھی۔''

یوں ہم نے اپنے بندے نوحؑ کی قدر افزائی فرمائی جس کی قوم نے اُسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کشتی کے ذریعے ہم نے اُسے اور اُس کے اہلِ ایمان ساتھیوں کو سیلاب سے محفوظ رکھا۔

آیت ۱۵ ﴿وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۱۵﴾ ''اور ہم نے اسے چھوڑ دیا ایک نشانی کے طور پر، تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا!''

یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی مشیتِ الٰہی سے محفوظ کر لی گئی اور کسی وقت ایک بہت بڑی نشانی کے طور پر دنیا کی نظروں کے سامنے آ جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح زیرِ زمین دفن شدہ شدّاد کی جنّتِ ارضی کے بارے میں اب دنیا جان چکی ہے یا بحیرۂ مُردار کی تہہ میں قومِ لوطؑ

کے شہروں کے کھنڈرات دریافت کر لیے گئے ہیں۔

آیت ۱۶ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۱۶﴾ ''تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا!''

آیت ۱۷ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۱۷﴾ ''اور ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے نصیحت اخذ کرنے کے لیے، تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا!''

یہ اس سورت کی ترجیعی (بار بار دہرائی جانے والی) آیت ہے اور اس میں ایک چیلنج کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر پوری سورت میں اس آیت کو چار مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اعلان کو پڑھ لینے یا سن لینے کے بعد ایک بندے پر گویا اتمامِ حُجّت ہو جاتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن کو سمجھنے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے استطاعت بھر کوشش شروع کر دے۔ خصوصی طور پر پڑھے لکھے خواتین و حضرات پر تو گویا فرض ہے کہ وہ عربی سیکھیں اور قرآن کے معانی و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ باقی علوم حاصل کر سکتے ہیں تو قرآن کا علم باقاعدہ حاصل نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس قدر اہم اور بنیادی فرض کے بارے میں لوگوں کو بتایا ہی نہیں جاتا۔ لیلۃ القدر میں نوافل پڑھنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے، مختلف اذکار و وظائف کے ثواب کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق قرآن کے مطالب و مفاہیم کا سمجھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

عربی سیکھنے کے حوالے سے ہمارے لیے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ یہ ایک زندہ زبان ہے۔ دنیا کے ایک بہت بڑے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اس کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ آج کوئی بین الاقوامی فورم ایسا نہیں جہاں پر عربی ترجمہ پیش کرنے کا انتظام نہ ہو۔ ہم مسلمانوں کو اپنی الہامی کتاب کی زبان کو سیکھنے کے لیے یہودیوں اور ہندوؤں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اگر یہ قومیں اپنی مُردہ زبانوں (عبرانی اور سنسکرت) کو زندہ کر سکتی ہیں تو ہم اپنی زندہ زبان کو کیوں نہیں سیکھ سکتے؟ بہرحال آج نوجوان نسل میں یہ احساس اجاگر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

آیات ۱۸ تا ۳۲

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ
رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ
اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾ وَ لَقَدْ
يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ
بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ
وَّ سُعُرٍ ﴿۲۴﴾ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ
اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾ اِنَّا مُرْسِلُوا
النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ
قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى
فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۳۰﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ
صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ
لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾

آیت ۱۸ ﴿كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۸﴾﴾ ''جھٹلایا تھا قومِ عاد نے بھی، تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟''

آیت ۱۹ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا﴾ ''ہم نے ان پر مسلّط کر دی ایک شُندو تیز ہوا''

﴿فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾﴾ ''ایک مسلسل نحوست کے دن میں۔''

آیت ۲۰ ﴿تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾﴾ ''وہ لوگوں کو یوں اُکھاڑ پھینکتی تھی جیسے وہ کھجور کے تنے ہوں اُکھڑی ہوئی جڑوں والے۔''

طویل القامت ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو کھجور کے تنوں کے ساتھ تشبیہہ دی گئی ہے کہ ہوا کے اس عذاب کی وجہ سے وہ مُردہ حالت میں زمین پر ایسے پڑے تھے جیسے جڑوں سے

اُکھڑے ہوئے کھجوروں کے تنے پڑے ہوں۔

آیت ۲۱ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾﴾ ''تو کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟''

آیت ۲۲ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور ہم نے اس قرآن کو آسان کر دیا ہے نصیحت حاصل کرنے کے لیے، تو ہے کوئی اس سے نصیحت حاصل کرنے والا!''

آیت ۲۳ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾﴾ ''قومِ ثمود نے بھی جھٹلایا خبردار کرنے والوں کو۔''

آیت ۲۴ ﴿فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ﴾ ''انہوں نے کہا: کیا ہم اپنے میں سے ہی ایک بشر کی پیروی کریں؟''

﴿اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۲۴﴾﴾ ''پھر تو یقیناً ہم پڑ جائیں گے گمراہی میں اور آگ میں۔''

اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت اور پیروی کرنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے اپنے آپ کو خود ہی گمراہی میں اور آگ کے گڑھے میں ڈال دیا۔ سُعُر جمع ہے سَعِیْر کی اور سَعِیْر کے معنی آگ کے ہیں۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ گویا حضرت صالح علیہ السلام ہی کے الفاظ میں آپؑ کو جواب دے رہے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام اُن سے کہتے تھے کہ تم لوگ اگر میری بات نہیں مانو گے تو آخرت میں جہنّم کی آگ کا ایندھن بنو گے۔ جواب میں وہ کہتے تھے کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو۔ اگر ہم تمہیں اپنا پیشوا مان کر تمہارے پیچھے چل پڑیں تو یہ گمراہی کا راستہ ہوگا اور ہمارے لیے اسی دنیا میں خود کو آگ میں جھونک دینے کے مترادف ہوگا۔

آیت ۲۵ ﴿ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا﴾ ''کیا یہ ذکر ہمارے مابین اسی پر القا کیا گیا ہے؟''

اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ سچ کہہ رہے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے وحی کے لیے آخر اسی شخص کا انتخاب کیوں کیا؟ اس منصب کے لیے اُس کی نظر ہمارے کسی بڑے سردار پر کیوں

نہیں پڑی؟

﴿بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾﴾ ''بلکہ یہ انتہائی جھوٹا اور شیخی خورا ہے۔''

لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے اور صرف اپنی بڑائی جتلانے اور شیخی بگھارنے کے لیے اس نے یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے۔

آیت ۲۶ ﴿سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾﴾ ''جلد ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون انتہائی جھوٹا اور شیخی خورا ہے!''

آیت ۲۷ ﴿اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾﴾ ''ہم بھیجے دیتے ہیں اونٹنی کو ان کی آزمائش کے لیے' تو آپؑ انتظار کیجیے ان کے بارے میں اور صبر کیجیے۔''

یہ خطاب حضرت صالح علیہ السلام سے ہے کہ ہم ان کے مطالبے کے مطابق اونٹنی بطور معجزہ ان کے سامنے لا رہے ہیں' جو ان کے لیے بہت بڑی آزمائش بن جائے گی۔ لیکن ابھی چونکہ ان کی مہلت باقی ہے اس لیے آپؑ صبر کے ساتھ ان کے بارے میں اللہ کے فیصلے کا انتظار کیجیے۔

آیت ۲۸ ﴿وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور انہیں بتا دیجیے کہ اب پانی ان کے مابین تقسیم ہوگا' ہر پینے کی باری پر حاضری ہوگی۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبے پر ایک چٹان سے حاملہ اونٹنی پیدا کر دی اور اس کا نام ناقۃُ اللہ (اللہ کی اونٹنی) [الاعراف: ۷۳ اور ہود: ۶۴] رکھا۔ وہ اونٹنی جب چشمے پر پانی پینے کے لیے آتی تو اس کی ہیبت سے ان کے تمام مویشی بدک کر بھاگ جاتے تھے۔ بالآخر باہمی مشورے سے طے ہوا کہ ایک دن اونٹنی پانی پیے گی اور دوسرے دن ان کے مال مویشی پانی پینے کے لیے آئیں گے۔ چنانچہ جب وہ دوسرے دن چشمے پر آتی تو چشمے کا سارا پانی پی جاتی۔

آیت ۲۹ ﴿فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾﴾ ''تو انہوں نے پکارا اپنے ایک ساتھی کو' پس اُس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی کونچیں کاٹ دیں۔''

انہوں نے اس اونٹنی سے جان چھڑانے کے لیے اپنی قوم کے ایک ایسے شخص کو تیار کیا جو ان میں سب سے زیادہ سخت دل تھا۔ اس بدبخت نے ناقۃ اللہ پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔

آیت ۳۰ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۰﴾﴾ ''پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا خبردار کرنا؟''

آیت ۳۱ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾﴾ ''ہم نے اُن پر بس ایک ہی چنگھاڑ بھیجی تو وہ باڑھ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح چُورا ہو کر رہ گئے۔''

اگر جانوروں کا کوئی بڑا سا گلہ کسی کھیت کی باڑھ کو روندتا ہوا گزر جائے تو وہ باڑھ چُورا چُورا ہو جاتی ہے' بالکل اسی طرح وہ نافرمان لوگ بھی چُورا چُورا ہو کر پڑے رہ گئے۔

آیت ۳۲ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾﴾ ''اور ہم نے تو اس قرآن کو آسان کر دیا ہے سمجھنے کے لیے' تو ہے کوئی سوچنے سمجھنے والا؟''

آیات ۳۳ تا ۴۲

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾ وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

آیت ۳۳ ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾﴾ ''لوطؑ کی قوم نے بھی خبردار کرنے والوں کو جھٹلایا۔''

آیت ۳۴ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾﴾ ''ہم نے اُن پر بھیج دی ایک ایسی تیز آندھی جس میں پتھر تھے' سوائے لوط کے گھر والوں

کے۔ اُن کو ہم نے نجات دے دی صبح کے وقت۔''

آیت ۳۵ ﴿نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۝۳۵﴾ ''وہ نعمت تھی ہمارے پاس سے۔ اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں اُس کو جو شکر کرتا ہے۔''

آیت ۳۶ ﴿وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ۝۳۶﴾ ''اور لوطؑ نے اُن کو خبردار کر دیا تھا ہماری پکڑ سے' لیکن انہوں نے شک کیا ان چیزوں پر جن کے بارے میں انہیں خبردار کیا گیا تھا۔''

وہ ہماری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اڑاتے رہے۔

آیت ۳۷ ﴿وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ﴾ ''اور انہوں نے اُس سے اُس کے مہمانوں کو لے جانا چاہا تو ہم نے ان کی آنکھوں کو مٹا دیا''

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے بدکردار لوگ ان خوبصورت مہمان لڑکوں کو حاصل کرنا چاہتے تھے جو اصل میں فرشتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اندھا کر دیا۔ بائبل میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے کہ ان میں سے ایک فرشتے نے ان لوگوں کی طرف اپنا ہاتھ پھیلایا تو وہ سب کے سب اندھے ہو گئے۔

﴿فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۳۷﴾ ''تو مزا چکھو اب میرے عذاب کا اور میرے خبردار کرنے کا۔''

آیت ۳۸ ﴿وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳۸﴾ ''اور اُن پر صبح ہی صبح آدھمکا ایک عذاب جو کہ ٹھہر چکا تھا۔''

آیت ۳۹ ﴿فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۳۹﴾ ''تو چکھو مزا اب میرے عذاب کا اور میرے خبردار کرنے کا۔''

آیت ۴۰ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۴۰﴾ ''اور ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن سمجھنے کو' تو ہے کوئی سوچنے سمجھنے والا؟''

یہ آیت یہاں چوتھی اور آخری مرتبہ آئی ہے۔

آیت ۴۱ ﴿وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝۴۱﴾ ''اسی طرح قومِ فرعون کے پاس بھی

آئے تھے خبردار کرنے والے۔''

آیت ۴۲ ﴿كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا﴾ ''انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلا دیا''

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ میں ان نشانیوں کی تعداد نو (۹) بتائی گئی ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ﴾ ''اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں دیں''۔ ان میں دو نشانیاں تو آپؑ کو ابتدا میں عطا ہوئی تھیں یعنی عصا کا اژدھا بن جانا اور ہاتھ کا چمکدار ہو جانا۔ جبکہ سات نشانیاں وہ تھیں جن کا ذکر سورۃ الاعراف کے سولہویں رکوع میں آیا ہے۔ یہ نشانیاں قومِ فرعون پر وقتاً فوقتاً عذاب کی صورت میں نازل ہوتی رہیں۔

﴿فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۴۲﴾ ''پھر ہم نے انہیں پکڑا' ایک زبردست' صاحبِ قدرت کا پکڑنا۔''

یعنی یہ کوئی معمولی اور کمزور پکڑ نہیں تھی کہ اس سے کوئی نکل بھاگتا' بلکہ اُس اللہ کی پکڑ تھی جو زبردست طاقت کا مالک ہے اور کائنات کے ہر معاملے میں اُسے پوری قدرت حاصل ہے۔

ان پیغمبروں اور ان کی نافرمان قوموں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد اب روئے سخن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کفارِ مکہ کی طرف پھیرا جا رہا ہے۔

آیات ۴۳ تا ۵۵

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۝۴۳ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۝۴۴ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝۴۵ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ۝۴۶ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝۴۷ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝۴۸ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝۴۹ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ۝۵۰ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۵۱ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۝۵۲ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝۵۳ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝۵۴ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۵۵

آیت ۴۳ ﴿اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ﴾ ’’(تو اے قریش!) کیا تمہارے کُفّار اُن (کُفّار) سے کچھ بہتر ہیں؟‘‘

زمانہ سابق میں جن قوموں نے کفر کی روش اختیار کی اُن کے انجام سے متعلق تمام تفصیلات تم لوگ جان چکے ہو۔ اب ذرا سوچو کہ تم میں سے جو لوگ ہمارے رسول ﷺ کا انکار کر کے کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں‘ کیا وہ کسی خاص خوبی کے حامل ہیں کہ گزشتہ کافر اقوام کی طرح ان پر عذاب نہیں آئے گا؟

﴿اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ﴾ ’’یا تمہارے لیے سابقہ الہامی کتب میں کوئی فارغ خطی آ چکی ہے؟‘‘

تم میں آخر کیا خوبی ہے کہ جس تکذیب اور ہٹ دھرمی کی روش پر پچھلی قوموں کو سزا دی گئی ہے وہی روش تم اختیار کرو تو تمہیں سزا نہ دی جائے؟ کیا تمہارے لیے آسمانی صحیفوں میں کوئی براءت نامہ لکھا ہوا ہے کہ تم پر عذاب نہیں آئے گا؟

آیت ۴۴ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ﴾ ’’یا یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک طاقتور جمعیّت ہیں اور بدلہ لینے پر قادر ہیں؟‘‘

آیت ۴۵ ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ ’’عنقریب ان کی جمعیّت شکست کھا جائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔‘‘

یہ پیشین گوئی جو ہجرت سے پانچ سال پہلے کر دی گئی تھی‘ میدانِ بدر میں حرف بحرف پوری ہوئی۔ روایات میں آتا ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلی رات میں حضور ﷺ نے سجدے کی حالت میں رو رو کر دعا کی۔ آپؐ کا یہ سجدہ بہت طویل تھا اور دعا بھی بہت طویل تھی۔ آپؐ کی اس دعا کا لُبِّ لُباب یہ تھا کہ اے اللہ! میں نے اپنی پندرہ سال کی کمائی لا کر اس میدان میں ڈال دی ہے۔ میں آخری رسول ہوں‘ میرے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔ اے اللہ! اس معرکے میں اگر یہ لوگ ہلاک ہو گئے تو پھر قیامت تک اس زمین پر تیری بندگی کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس رات آپ ﷺ کے عریشے پر پہرے کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مامور تھے‘ وہ سجدے میں آپؐ کی کیفیت کا مشاہدہ کر رہے تھے اور دعا کے رِقّت آمیز الفاظ سن رہے تھے۔ اس دوران ایک موقع ایسا بھی آیا جب حضرت ابوبکرؓ سے رہا نہ گیا اور وہ پکار اُٹھے: حَسْبُكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ..... کہ

اے اللہ کے رسول ﷺ! اب بس کر دیجیے۔ پھر جب حضور ﷺ نے سجدے سے سر مبارک اٹھایا تو آپؐ کی زبان مبارک پر یہی الفاظ تھے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ کہ یہ لوگ اپنی طرف سے بہت بڑا لشکر لے کر آئے ہیں۔ ان کا یہ لشکر یہاں شکست سے دوچار ہوگا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ (۲)

آیت ۴۶ ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ﴾ ’’بلکہ ان کے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور قیامت بہت بڑی آفت ہے اور بہت زیادہ کڑوی ہے۔‘‘

عربی میں کڑوی چیز کو مُرٌّ کہتے ہیں اور اَمَرُّ کے معنی ہیں بہت ہی زیادہ کڑوی۔ سیاقِ مضمون میں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں پے در پے شکست مشرکینِ عرب کا مقدّر ہے۔ عنقریب (۹ ہجری میں) ان پر ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب جزیرہ نمائے عرب کی سرزمین ان پر تنگ ہو جائے گی۔ اس وقت ان کے پاس اسلام قبول کرنے یا حدودِ عرب سے باہر چلے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ ایک مضبوط جمعیت اور اعلیٰ پائے کی جنگی صلاحیت کے باوجود ان کی یہ ہزیمتیں‘ نقصانِ مال و جان اور ذلّت و رسوائی اللہ کے عذاب ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن یہ تو چھوٹے چھوٹے عذاب ہیں اور دنیا کی زندگی کی حد تک عارضی نوعیت کی تکالیف ہیں۔ جبکہ انہیں بہت بڑے اور دائمی عذاب کا سامنا تو آخرت میں کرنا پڑے گا۔

آیت ۴۷ ﴿اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ﴾ ’’یقیناً یہ مجرمین گمراہی میں ہیں اور یہ آگ (کے مختلف طبقات) میں ہوں گے۔‘‘

آیت ۴۸ ﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ۭ﴾ ’’جس دن یہ گھسیٹے جائیں گے آگ میں اپنے چہروں کے بل۔‘‘

﴿ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ ’’(ان سے کہا جائے گا:) اب چکھو آگ کی لپٹ کا مزا!‘‘

۲۔ صحیح البخاری‘ کتاب تفسیر القرآن‘ باب قولہ ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾‘ ومتعدد مقامات‘ ح: ۳۹۵۳‘ ۲۹۱۵‘ ۴۸۷۷۔

آیت ۴۹ ﴿اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾﴾ ’’یقیناً ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔‘‘

آیت ۵۰ ﴿وَمَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾﴾ ’’اور ہمارا اَمر تو یکبارگی ہوتا ہے‘ جیسے نگاہ کا لپک جانا۔‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ کا امر بیک دفعہ پلک جھپکنے کی طرح پورا ہوتا ہے۔ اللہ کے امر کی یہ وہی شان ہے جو قرآن حکیم میں جگہ جگہ ’’کُن فَیَکُون‘‘ کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی وہ جب کسی چیز کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ اس کی مشیت کے مطابق اُسی وقت ہو جاتی ہے۔

آیت ۵۱ ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَاۤ اَشْیَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾﴾ ’’تو (اے قریشِ مکّہ) ہم نے تم جیسے بہت سے لوگوں کو ہلاک کیا ہے‘ تو کوئی ہے اس سے سبق حاصل کرنے والا؟‘‘

تمہاری تذکیر اور یاد دہانی کے لیے قرآن حکیم میں سابقہ اقوام کے انجام کی عبرت انگیز تفاصیل بار بار بیان کی گئی ہیں۔ تاریخی حوالوں سے بھی ان اقوام کے حالات سے تم لوگ اچھی طرح واقف ہو۔ اب تم لوگ چاہو تو ان کے انجام سے سبق حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ بے شمار آیاتِ آفاقی و انفسی بھی تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم لوگ کبھی ان آیات کا مشاہدہ دل کی آنکھ سے کرو تو وہ بھی تمہاری ہدایت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

آیت ۵۲ ﴿وَكُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾﴾ ’’اور وہ تمام اعمال جو ان لوگوں نے کیے ہیں وہ صحیفوں میں محفوظ ہیں۔‘‘

آیت ۵۳ ﴿وَكُلُّ صَغِیْرٍ وَّكَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾﴾ ’’اور ہر ایک چھوٹی اور بڑی چیز لکھی ہوئی ہے۔‘‘

قیامت کے دن یہ لوگ اپنے اعمال ناموں میں اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کا اندراج دیکھ کر حیران و ششدر رہ جائیں گے۔ سورۃ الکہف کی یہ آیت اس منظر کا نقشہ دکھاتی ہے جب سرِمحشر ان مجرمین کے سامنے ان کے اعمال نامے کھولے جائیں گے:

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْهِ وَیَقُوْلُوْنَ

یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾﴾

’’اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہوگا اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو‘ مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔ اور وہ اسے موجود پائیں گے جو عمل بھی انہوں نے کیا ہوگا۔ اور آپ کا رب ظلم نہیں کرے گا کسی پر بھی۔‘‘

آیت ۵۴ ﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴿۵۴﴾﴾ ’’یقیناً متقین باغات اور نہروں (کے ماحول) میں ہوں گے۔‘‘

یہ مقام ان خوش نصیب لوگوں کو عطا ہوگا جو اپنی دنیا کی زندگی میں اللہ سے ڈرنے والے‘ آخرت کے خیال سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہنے والے‘ اللہ کے احکام کی پابندی کرنے والے‘ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے والے اور اس حوالے سے پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے تھے۔

آیت ۵۵ ﴿فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾﴾ ’’بہت اعلیٰ راستی کے مقام میں اُس بادشاہ کے پاس جو اقتدارِ مطلق کا مالک ہے۔‘‘

ان خوش قسمت لوگوں کے مقام و مرتبہ کا ذکر ایسے ہی الفاظ کے ساتھ سورۂ یونس کی اس آیت میں بھی ہوا ہے: ﴿اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ﴾ (آیت ۲) ’’اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس بہت اونچا مرتبہ ہے‘‘۔ یعنی ان لوگوں کو آخرت میں شہنشاہِ ارض و سما کا خصوصی قُرب حاصل ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین یاربَّ العَالَمِین!! ❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

نوعِ انسانی کے اصل اور مستقل دشمن کون؟

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

۱۷/اکتوبر ۲۰۰۱ء کا فکر انگیز خطاب‘ بمقام قرآن اکیڈمی‘ کراچی

تلاوتِ قرآن پاک اور ادعیہ ماثورہ کے بعد:

آج کی نشست میں مجھے موجودہ انتہائی تشویش ناک عالمی صورتحال کے پس منظر پر گفتگو کرنی ہے کہ اس کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں اور نوعِ انسانی کے اصل اور مستقل دشمن کون ہیں۔ گویا ع ’’کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں!‘‘

ہوسکتا ہے کہ امنِ عالَم تہ و بالا ہو جائے۔ کہا جا رہا ہے کہ شاید تیسری عالمگیر جنگ شروع ہو جائے۔ امریکی صدر بش کہتے ہیں کہ دس سالہ جنگ ہوگی۔ بظاہر تو معاملہ بہت عجیب نظر آتا ہے۔ ایک دھان پان سے آدمی اسامہ بن لادن کے خلاف عالمی طاقتیں جمع ہو کر کارروائی کر رہی ہیں۔ ان سے ملنے والے بتاتے ہیں کہ وہ بہت ہی دل آویز شخصیت کے مالک ہیں۔ نرم لہجہ‘ بہت ہی دھیمے انداز میں بات کرنے والے‘ متواضع اور متوازن مزاج انسان ہیں‘ جن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ شخص دنیائے کفر کی نیندیں حرام کرسکتا ہے اور اس پر دہشت گردی کے الزامات بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ پھر افغانستان کو دیکھیں کہ دُنیوی اور مادّی اعتبارات سے اس کی کیا حیثیت ہے اور امریکہ جیسی سپریم پاور کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ ہے‘ لیکن اس پر فوج کشی کے لیے کتنا اہتمام ہو رہا ہے کہ مشرق اور مغرب کے وسائل و ذرائع جمع کیے جا رہے ہیں۔ اُدھر بحیرۂ روم میں اور اِدھر بحر ہند میں ڈیگو گارشیا جیسے دور دراز علاقوں تک اپنے اڈے تیار کیے جا رہے ہیں۔ بڑے مہیب قسم کے ایئر کرافٹ کیریئرز پہنچ گئے ہیں اور ایسے ہوائی جہاز جن کی شکل دیکھ کر ہی

انسان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے‘ ان کے غول کے غول پہنچ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ علّامہ اقبال نے کہا تھا ع

’’سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف!‘‘

مَیں نے اس مصرع میں تھوڑی سی ترمیم کی ہے ع

’’سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ حجاز و حولِ قدس!‘‘

اس لیے کہ مدینہ اور نجف کو تو مَیں ایک ہی شے سمجھتا ہوں۔ وہ نُورِ معرفت جو محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پھیلا ہے‘ مدینے میں تھا اور اُسی کے ایک حامل حضرت علی رضی اللہ عنہ نجف میں مدفون ہیں۔ حجاز میں مکّہ مکرمہ بھی شامل ہے اور مدینہ منورہ بھی‘ جہاں قرآن نازل ہوا‘ جہاں قرآن کا نُور اترا۔ ایک ’’حولِ قدس‘‘ ہے‘ یعنی بیت المقدس کے اردگرد کا علاقہ جس کو قرآن کہتا ہے: ﴿اَلَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ﴾ ’’جس کے ماحول (اردگرد) کو ہم نے برکت دی ہے۔‘‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سفرِ معراج کا پہلا مرحلہ بیت اللہ سے بیت المقدس تک تھا‘ اور پھر معراج کے خلائی سفر کا آغاز اُس چٹان سے ہوا جس پر گنبدِ صخرہ بنا ہوا ہے۔ بیت المقدس کے آس پاس سینکڑوں انبیاء کرام علیہم السلام دفن ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی پوری نسل وہاں دفن ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کی ایک شاخ جو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نسل سے ہے‘ اس کے سینکڑوں نبی وہاں دفن ہیں۔ وہی ان کا مرکز تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام بھی وہیں آئے تھے۔ Old Testament اور New Testament کا نزول اسی سرزمین پر ہوا تھا جو اللہ کی پرانی کتابیں ہیں لیکن اب تحریف شدہ ہیں۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۴) ’’ہم نے تورات نازل کی تھی جس میں ہدایت بھی تھی اور نُور بھی تھا۔‘‘ تحریف سے اس میں کمی تو آئی ہے لیکن پھر بھی ہدایت اور نُور سے بالکل خالی تو نہیں ہے۔ اور قرآن کے بارے میں فرمایا: ﴿وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا﴾ (التغابن:۸) ’’اور اُس نُور پر (ایمان لاؤ) جو ہم نے نازل کیا ہے۔‘‘ تو ان دونوں کے حوالے سے اور احادیث نبویہ کے حوالے سے ع ’’سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ حجاز و حولِ قدس!‘‘

انسانیت کا دشمن اوّل و اعظم: ابلیسِ لعین

اِس وقت درپیش عالمی صورت حال کا پس منظر کیا ہے‘ پیش منظر کیا ہے‘ کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس کے پیچھے کارفرما اصل کردار کون ہیں‘ آج اس کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ سب سے پہلی

بات یہ کہ انسانیت کا اور نوعِ انسانی کا ازلی اور ابدی دشمن ابلیس لعین ہے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جو ماوراء الطبیعیات (Metaphysics) سے متعلق ہیں۔ ابلیس جن ہے اور جنّات غیر مرئی (invisible) دنیا سے تعلق رکھتے ہیں‘ جو نظر نہیں آتی۔ فرشتے بھی غیر مرئی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسانوں اور حیوانات کی دنیا مرئی (visible) ہے۔ آج جو سائنسی نقطۂ نظر ہے اس کا عام لوگوں پر بھی یہ اثر ہوا ہے کہ وہ غیر مرئی دنیا کی باتوں کی طرف توجّہ نہیں کرتے۔ ہمارا عقیدہ تو ہے کہ جن بھی ہیں‘ فرشتے بھی ہیں‘ لیکن ان کی کوئی اہمیت ہماری نگاہوں میں نہیں ہے۔ ساری نگاہیں مرئی دنیا پر مرکوز ہیں۔ مابعد الطبیعیات کے مضمون کو تو اب ایک اضافی شے سمجھ کر کہا جاتا ہے کہ اسے ختم کر دینا چاہیے۔ یونیورسٹیز سے فلسفے کے ڈیپارٹمنٹس ختم ہو رہے ہیں کہ اس کی کیا ضرورت ہے! اصل شے یہ دنیا ہے‘ یہ عالم ہے‘ یہ کائنات ہے‘ یہ مادہ ہے‘ یہ حیاتِ انسانی اور حیاتِ دُنیوی ہے۔

اس موضوع پر میرا ایک مضمون جون ۱۹۶۶ء میں ’’اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام‘‘ کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس میں عہدِ حاضر کی تہذیب کے تین بنیادی اصول واضح کیے گئے تھے: (۱) خدا ہے یا نہیں ہے‘ اس بحث میں نہ پڑو۔ کائنات تو ہے نا! (۲) روح آج تک کسی نے دیکھی ہی نہیں‘ لہٰذا اس کے بارے میں گفتگو کا فائدہ کیا ہے؟ جبکہ مادہ (matter) تو موجود ہے! (۳) عالمِ آخرت کوئی ہے یا نہیں ہے؟ کسی نے مرنے کے بعد آ کر یہ بتایا ہے؟ لہٰذا اس بحث میں نہ پڑو‘ یہ عالمِ دُنیا تو ہے نا! ساری توجّہ اس پر صَرف کرو۔ تو خدا کے مقابلے میں کائنات پر توجّہ‘ روح کے مقابلے میں مادّے پر توجّہ اور حیاتِ اُخروی کے مقابلے میں حیاتِ دُنیوی پر توجّہ۔ یہ ہے اصل میں اس تہذیب جدید کا خلاصہ۔ شاید آپ کو میری کچھ باتیں ایسی لگیں گی کہ وہ دُنیوی ماحول کے متعلق نہیں‘ لیکن وہ دین کی بڑی بنیادی باتیں ہیں۔

قرآن مجید کا فلسفۂ کائنات و انسان

اصل میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا فلسفۂ کائنات و انسان کیا ہے اور عالمِ انسانیت میں ازل سے جو کشاکشِ حق و باطل اور خیر و شر ہے‘ اس کے پیچھے کون سا فلسفہ کارفرما ہے! ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

اللہ تعالیٰ نے جو مخلوقات پیدا کی ہیں ان میں ایک تقسیم تو یہ ہو سکتی ہے: ذی حیات اور بغیر

حیات۔ یعنی جان دار چیزیں اور بے جان چیزیں۔ بے جان چیزیں بے شمار ہیں۔ تمام فلکیات‘ پوری کائنات‘ زمین‘ پہاڑ وغیرہ۔ جان دار مخلوق میں ایک تقسیم اور ہے۔ دو کا تعلق غیر مرئی دُنیا سے ہے۔ ایک فرشتے جن کی پیدائش نُور سے ہوئی ہے‘ دوسرے جنّات جو انسانوں سے پہلے اور نار (آگ) سے پیدا کیے گئے تھے۔ از روئے الفاظِ قرآنی ﴿وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾﴾ (الحجر) ’’جنّات کو تو ہم بہت پہلے پیدا کر چکے تھے آگ کی لپٹ سے۔‘‘ فرشتے اور جنّات نظر نہ آنے والی مخلوق ہیں۔ تیسری قسم میں انسان اور اس دنیا میں جتنے بھی حیوانات ہیں‘ سب شامل ہیں۔ ان کا تعلق مرئی دُنیا سے ہے۔ ان کا مادۂ تخلیق یہ زمین ہے۔ یہ تراب (مٹّی) سے بنے ہوئے ہیں‘ قشرِ ارض (Crust of the Earth) سے بنے ہوئے ہیں۔

اب ان میں ایک تقسیم اور ہے۔ ایک تو یہ کہ ان تمام میں شعور موجود ہے۔ حیوانات میں بھی شعور تو ہے مگر خود شعوری جسے کہتے ہیں یہ صرف تین میں ہے: فرشتہ‘ جن اور انسان۔ حیوانات میں خود شعوری نہیں ہے۔ شعور اور خود شعوری کا فرق اس طرح سمجھئے کہ مَیں آپ کو دیکھ رہا ہوں‘ آپ مجھے دیکھ رہے ہیں‘ کوئی کُتّا بھی یہاں ہوتا تو وہ مجھے دیکھ رہا ہوتا‘ لیکن کُتّا کسی کو دیکھتے ہوئے یہ احساس نہیں رکھتا کہ ’’مَیں دیکھ رہا ہوں‘‘۔ یعنی کسی حیوان کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ دیکھ تو وہ رہا ہے‘ لیکن اُسے ’’مَیں‘‘ کا احساس نہیں ہے۔ مَیں جب دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ مَیں کوئی شے ہوں جو دیکھ رہا ہوں۔ یہ خود شعوری ہے‘ یعنی کسی بھی کام کو کرتے ہوئے اپنے وجود کا احساس کہ یہ میرا فیصلہ ہے‘ میری رائے ہے۔ یہ ہے درحقیقت خود شعوری‘ انا‘ خودی۔ یہ حیوانات میں نہیں ہے۔ یہ صرف ملائکہ‘ جنّات اور انسان میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے ملائکہ کو اور انسانی ارواح کو نُور سے پیدا کیا‘ پھر نار سے جنّات کو پیدا کیا‘ پھر مٹّی سے جسدِ آدم کو بنایا اور اس میں روح پھونک دی تو آدم علیہ السلام بن گئے۔ اللہ نے اعلان کر دیا کہ خلافتِ ارضی آدم کو عطا کی جا رہی ہے۔ اس پر ایک بڑا پُر پیچ مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ تھوڑا سا اشکال تو فرشتوں کو بھی ہوا۔ سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع میں فرشتوں کا یہ قول نقل ہوا ہے: ﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ﴾ یعنی پروردگار! تُو اس آدم کو زمین کے اندر خلافت اور اختیار دے رہا ہے؟ یہ تو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون ریزی کرے گا‘ جبکہ ہم تیری تسبیح و تحمید میں لگے ہوئے ہیں۔ جو حکم ہو‘

ارشاد ہو ہم بجالاتے ہیں۔ تو اس کی ضرورت کیا ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا: ﴿قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۳۰﴾ (البقرۃ) کہ جو کچھ مَیں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ جو میری مشیت اور حکمت ہے وہ مَیں ہی جانتا ہوں' ضروری نہیں کہ تم اس میں share کر سکو۔ لیکن جِنّات میں سے ایک جِن عزازیل آدم کو خلافتِ ارضی عطا ہونے پر تکبّر اور حسد کا شکار ہو گیا۔ جِنّات کو ملائکہ کے ساتھ اس اعتبار سے قرب حاصل ہے کہ وہ نُور سے پیدا کیے گئے اور یہ نار سے پیدا کیے گئے' جبکہ انسان مٹّی سے پیدا کیا گیا۔ آگ بھڑکتی ہے' لپکتی ہے' اُوپر اٹھتی ہے' اس میں توانائی ہے۔ نُور اور نار میں بڑا قرب ہے اور عربی کے ایک قاعدہ کی رو سے یہ ایک ہی لفظ ہے' اس لیے کہ دونوں کا مادہ ایک ہی ہے۔ حروفِ علّت تو ایک دوسرے کی جگہ آ جاتے ہیں۔ ''ا' و' ی'' حروفِ علّت ہیں۔ نُور میں واؤ ہے اور نار میں الف ہے' اس اعتبار سے ان دونوں میں قرب ہے' اگرچہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فرشتہ نُور سے پیدا کیا گیا ہے' وہ پاک ہے اور اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتا۔ ﴿لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَہُمۡ وَیَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ ۶﴾ (التحریم) ''اللہ تعالیٰ ان کو جو بھی حکم دیتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے' بلکہ جو حکم دیا جاتا ہے اسے مان لیتے ہیں۔'' فرشتوں کو ذرا سا اشکال تھا' جواب مل گیا تو خاموش ہو گئے۔ لیکن عزازیل کو ایک تو جِن ہونے کی وجہ سے فرشتوں سے کچھ نہ کچھ قرب تھا' دوسرے یہ علم' زہد اور عبادت میں اتنا اونچا تھا کہ ملائکہ ہی کی صف میں شامل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے علَمِ بغاوت بلند کر دیا۔ جب فرشتوں کو حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے اسے سجدہ کیا لیکن عزازیل نے انکار کر دیا اور بغاوت پر اُتر آیا۔

یہ جِن فرشتوں میں کیوں شامل ہو گیا' اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ آدم کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں اور جِنّوں سب کو تھا' لیکن فرشتوں کا ذکر بر سبیلِ تغلیب کیا گیا ہے۔ گویا سجدے کا حکم تمام جِنّوں کے لیے بھی تھا لیکن اُس نے سرتابی کی۔ بعض اور جِنّوں نے بھی کی ہو گی لیکن یہ ان کا سرخیل تھا' اس لیے اس کا ذکر قرآن مجید میں آ گیا۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ اگرچہ یہ جِن تھا لیکن اپنے زہد' علمیت' تقویٰ اور عبادت گزاری کی بنیاد پر فرشتوں میں شامل ہو گیا تھا۔ بہرحال ابلیس نے انکار کر کے علَمِ بغاوت بلند کیا اور پھر اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی کہ پروردگار! تُو مجھے قیامت تک کے لیے مہلت دے کہ مَیں یہ ثابت کر دوں کہ یہ آدم اور اِس کی ذُریت اِس

منصب کی اہل نہیں۔ مَیں انہیں گمراہ کر کے چھوڑوں گا اور انہیں غلط راستوں پر لے جاؤں گا۔ انہیں تیری توحید کی صراطِ مستقیم سے موڑ کر مختلف پگڈنڈیوں پر لے جاؤں گا اور تُو دیکھے گا کہ ان کی اکثریت تیرے فرماں بردار اور شکر گزار بندوں کی نہیں ہے۔

اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن مجید میں سات مرتبہ آیا ہے اور کسی استعارے کے طور پر نہیں بلکہ واقعے کی حیثیت سے آیا ہے۔ اس کے باوجود جب Newtonian دور کے آنے کے بعد ہمارے ہاں سرسید احمد خان (اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے) نے نیا علمِ کلام شروع کیا تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ نہ فرشتوں کا کوئی وجود ہے اور نہ جِنّات کا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرشتوں کا اپنا صاحب تشخص وجود ہے' اگرچہ غیر مرئی ہے' ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے' لیکن فرشتہ انسانی شکل اختیار کر سکتا ہے' اور حضرت جبریل علیہ السلام بارہا انسانی شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اسی طرح جِنّات آگ سے پیدا کیے گئے' تاہم وہ آگ نہیں ہیں۔ جیسے ہم مٹّی سے پیدا کیے گئے ہیں' لیکن ہم مٹّی نہیں ہیں۔ اس وقت ہمارا جسم پروٹوپلازم ہے اور living matter ہے۔ چنانچہ جِنّات آگ نہیں ہیں' یہ غیر مرئی ہیں اور انسانی شکل اختیار کر کے انسانی معاشرے میں آ سکتے ہیں۔

درحقیقت یہ ہیں وہ عقائد کہ جن کے بارے میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن متزلزل ہیں۔ فزکس کا Newtonian دور شروع ہوتے ہی اس طرح کے شبہات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ جیسے قرآن مجید میں منکرینِ قیامت کا قول نقل ہوا ہے کہ ﴿اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَیۡقِنِیۡنَ ۳۲﴾ (الجاثیۃ) یعنی کچھ گمان سا تو ہوتا ہے کہ جو آپؐ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا اور حساب کتاب ہو گا تو بات معقول ہے کہ جزا و سزا ہونی چاہیے' لیکن اس پر دل نہیں ٹھکتا' یقین نہیں آتا۔ اسی طرح آج کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان چیزوں کو مانتا تو ہے کہ قرآن و حدیث میں اس کا ذکر موجود ہے اور تمام علماء بھی کہتے ہیں کہ یہ چیزیں عقائد میں شامل ہیں' انہیں تسلیم کیا جانا ضروری ہے' لیکن وہ پختہ یقین پیدا نہیں ہوتا کہ واقعتاً یہ حقائق ہیں۔ یہ قصّہ قرآن مجید میں ایک مدنی سورۃ یعنی البقرۃ میں اور باقی چھ مکی سورتوں یعنی الاعراف' الحجر' بنی اسرائیل' کہف' طٰہٰ اور صٓ میں آیا ہے۔

قصّہ آدم وابلیس: سورۃ الاعراف کے آئینے میں

سورۃ الاعراف میں اس واقعے کا ذکر اس طرح ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ﴾ (آیت ۱۱)

''اور (دیکھو اے انسانو!) ہم نے تمہاری تخلیق کی اور پھر تمہاری ایک خاص صورت گری کر دی' پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ جھک جاؤ آدم کے آگے تو وہ سب کے سب جھک گئے سوائے ابلیس کے۔''

اس کے ضمن میں سورۃ الکہف میں وضاحت آئی ہے کہ:

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ (آیت ۵۰)

''وہ جنّوں میں سے تھا' لہٰذا اُس نے اپنے ربّ کے حکم کی نافرمانی کی۔''

یہ چونکہ جن تھا' صرف اپنے زہد وعبادت اور تقویٰ کی وجہ سے فرشتوں میں شامل ہو گیا تھا' تو اس موقع پر اس کے اندر وہ شیطنت پیدا ہو گئی کہ اُس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ﴿لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝۱۱﴾ ''وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہیں ہوا''۔ ﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ﴾ ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ کس چیز نے تجھے روکا کہ تُو نے سجدہ نہیں کیا جبکہ مَیں نے تجھے حکم دیا؟'' ﴿قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ﴾ ''کہا: مَیں اس سے بہتر ہوں'۔ ﴿خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲﴾ ''مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹّی سے۔''

درحقیقت یہ اپنی برتری کا احساس ہی تھا کہ تکبّر' گھمنڈ' غرور اور سرکشی کی وجہ سے اُس نے کہا کہ مَیں اس سے بہتر ہوں۔ تو اصل میں ابلیسیت کا حقیقی سبب یہی تکبّر اور گھمنڈ ہے۔ اس تکبّر اور گھمنڈ کی وجہ سے اس میں حسد بھی پیدا ہو گیا۔ یہاں ابلیس کے معنی نوٹ کریں۔ اَبْلَسَ' یُبْلِسُ انتہائی مایوس ہو جانے کو کہتے ہیں۔ جب اُس نے اللہ کے حکم سے سرتابی کی تو اللہ کی رحمت سے دُور ہو گیا' اللہ کی لعنت کا مستحق قرار پایا' راندۂ درگاہِ حق ہو گیا اور اسے اپنے لیے خیر اور بھلائی کی کوئی اُمید نہیں رہی۔ مُبْلِس اسے کہتے ہیں کہ جو بالکل مایوس ہو چکا ہو۔ اِبلیس' اِفعیل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا مطلب ہے ''انتہائی مایوس شخصیت''۔ چنانچہ اس مایوسی کے عالَم میں اب

اُس نے اس بات پر کمر کس لی کہ ع ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے!'' میرا تو جو بیڑا غرق ہونا تھا وہ ہو گیا' اب میں آدم اور اس کی نسل کو بھی گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس کو یہ درجہ کیوں ملا کہ مجھے اس کے آگے جھکایا گیا؟ یہ دراصل حسد ہے کہ جس کی آگ میں وہ جل رہا ہے۔ ایک تو وہ خود بھی آگ سے بنا ہوا ہے اور دوسرے اس پر مزید حسد کی آگ' تو یہ ''نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ'' کے برعکس ''نَارٌ عَلٰی نَارٍ'' والا معاملہ ہو گیا۔ لہٰذا ایک تو حسد اور اس کے علاوہ گھمنڈ اور تکبّر نے اسے انتہا تک پہنچا دیا۔ اس کے گھمنڈ اور تکبّر کا ذکر سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع میں بھی آیا ہے: ﴿اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴﴾ (البقرۃ) ''اُس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور انکار کرنے والوں میں سے ہو گیا۔''

اس کے بعد فرمایا: ﴿قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا﴾ ''(اللہ نے) فرمایا کہ تم یہاں سے نیچے اُترو' تمہیں یہ حق نہیں کہ تم اس میں تکبّر کرو'' یعنی یہ جنّت ہی میں مقیم تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے وہاں سے نکال دیا۔ ﴿فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۱۳﴾ ''پس نکل جاؤ' اب تم چھوٹے اور ذلیل ورسوا لوگوں میں سے ہو گئے۔''

﴿قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۴﴾ ''(اُس نے ایک عرضداشت پیش کی اور) کہا: پروردگار! مجھے اُس دن تک کے لیے مہلت دے دے کہ جس دن یہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے'' یعنی جس دن سارے انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور بعث بعد الموت کا مرحلہ پیش آئے گا' اُس دن تک کے لیے میری زندگی دراز کر دے!

دراصل جِنّات کی زندگیاں ہماری زندگیوں سے کہیں زیادہ طویل ہیں۔ ان کی زندگی ہزار برس کی بھی ہو سکتی ہے' دو ہزار برس کی بھی ہو سکتی ہے' لیکن ابدی زندگی ان میں سے کسی کی بھی نہیں ہے' سوائے اُس خاص جن ابلیس کے کہ جس کا اصل نام عزازیل تھا اور جس نے اللہ تعالیٰ سے خصوصی مہلت مانگی۔ ﴿قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝۱۵﴾ ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ جاؤ تمہیں مہلت دے دی گئی!''

اب اُس کی ابلیسیت اس طرح زبان پر آئی کہ اُس نے کہا کہ پروردگار! جس طرح تُو نے مجھے گمراہ کیا..... یعنی تُو نے ہی آدم کو یہ شرف' مقام اور مرتبہ عطا کیا کہ مجھے اس کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور تیرے ہی اس حکم کی نافرمانی کی وجہ سے میں راندۂ درگاہ ہو گیا' چنانچہ تیرا ہی

فعل ہے کہ جو میری اس گمراہی کا سبب بنا۔ تو گویا تُو نے ہی مجھے گمراہ کیا۔

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۱۶﴾ ''کہنے لگا: اچھا تو جس طرح تُو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے تو اب میں تیری (توحید کی) صراطِ مستقیم پر اُن انسانوں کی گھات میں بیٹھوں گا (اور اُن پر تاک لگا کر حملہ کروں گا)۔'' ﴿ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ﴾ ''پھر میں اُن پر سامنے سے بھی حملہ آور ہوں گا اور اُن کے پیچھے سے بھی' اور اُن کے دائیں جانب سے بھی اور بائیں جانب سے بھی۔'' ﴿وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝۱۷﴾ ''اور تو اُن میں سے اکثر کو شکرگزار نہیں پائے گا۔''

﴿قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ﴾ ''(اللہ نے) فرمایا: تُو دفع ہو جا یہاں سے مذمّت زدہ ہو کر ٹھکرایا ہوا'' ﴿لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَــَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۸﴾ ''ان میں سے جو بھی تیری پیروی کرے گا تو مَیں لازماً تم سب سے جہنّم کو بھر دوں گا''۔ یعنی جنّات میں سے سب سے پہلے تو خود تمہیں اور پھر جنّات میں سے جو تیری پیروی کریں گے اور انسانوں میں سے بھی جو تیری پیروی کریں گے' ان سب سے میں جہنّم کو بھر دوں گا' یہ میرا فیصلہ ہے۔

یہ فیصلہ سنانے کے بعد فرمایا: ﴿وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا﴾ ''اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنّت میں رہو اور جنّت میں جہاں سے جو چاہو کھاؤ'' ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۹﴾ ''مگر (ایک درخت کی طرف اشارہ کر دیا کہ) اس درخت کے قریب مت پھٹکنا' ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے''۔ ﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ ''اب شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کی''۔ اس وسوسہ اندازی کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے شیطان اور اُس کے چیلوں کو دے رکھی ہے' جیسا کہ سورۃ الناس میں فرمایا: ﴿الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵﴾ ''وہ کہ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے''۔ تو اسی طرح کی وسوسہ اندازی اُس نے آدم اور حوا کے دلوں میں بھی کی۔

﴿لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا﴾ ''تاکہ کھول دے اُن پر اُن کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں''۔ یعنی آدم اور حوا کو جنّت کی رہائش کے دوران

اللہ تعالیٰ نے جنّت کا کوئی لباس عطا کر رکھا تھا' جس کے بارے میں اِس وقت ہم نہیں جان سکتے کہ وہ کیسا تھا' لیکن اس درخت کے پھل کھانے کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عریاں ہو گئے اور اُن پر اُن کی شرم گاہیں نمایاں ہو گئیں۔ سورۂ طٰہٰ میں یہ بھی آتا ہے کہ جب انہیں اپنے برہنہ ہونے کا احساس ہوا تو انہوں نے جنّت کے پتّوں سے اپنی شرم گاہوں کو ڈھانکنا شروع کر دیا۔ بہرحال یہاں شیطان کی وسوسہ اندازی کا ذکر ہو رہا ہے: ﴿وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝۲۰﴾ ''(شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتے ہوئے) کہا کہ تمہارے ربّ نے تمہیں اس درخت سے محض اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں ہمیشگی کی زندگی نہ حاصل ہو جائے''۔ حالانکہ خود فرشتوں سے تو آدم علیہ السلام کو سجدہ کروایا گیا تھا' لیکن ایک تو انسان کی سرشت میں نسیان کا مادہ رکھا گیا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ شیطان کے اغوا سے اثر قبول کر لیتا ہے۔ اگرچہ شیطان کو اس پر اختیار نہیں ہے' تاہم وہ وسوسہ اندازی کے ذریعے اور طرح طرح کے خیالات پیدا کر کے انسان کو غلط راستے پر ڈال سکتا ہے۔

﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۱﴾ ''اور اُس نے اُن دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ میں تو تمہارا سچا خیر خواہ ہوں''۔ میں تمہاری خیر خواہی میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ اس درخت کے پھل کو کھا لو۔ ﴿فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ﴾ ''پھر اُن دونوں کو اُس نے دھوکے سے پھسلا لیا۔'' ﴿فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ﴾ ''پھر جب اُن دونوں نے اس درخت کا مزا چکھ لیا تو ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ جنّت کے پتّوں سے اپنی شرم گاہوں کو ڈھانکنے لگے۔''

اس سے آگے چند آیات کے بعد بنی آدم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ﴾ ''اے بنی آدم! بے شک ہم نے تمہارے لیے لباس اُتارا ہے جس سے تم اپنی شرم گاہوں کو چھپاتے ہو اور یہ تمہارے لیے آرائش بھی ہے۔'' ﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ﴾ ''اور (ان سب سے اوپر) ایک لباس تقویٰ کا ہے جو بہت ہی بہتر ہے۔'' یہ درحقیقت انسان کی شخصیت میں شرم' حیا' عفّت و عصمت کی صفات ہیں اور انہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ((اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ)) یعنی حیا

ایمان کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔ چنانچہ حیا کی صفت تو سب سے اعلیٰ ہے۔ ﴿ذٰلِکَ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ ”یہ اللہ کی آیات میں سے ہیں (جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں) تاکہ یہ نصیحت اخذ کریں۔“

﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ کَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡکُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ یَنۡزِعُ عَنۡہُمَا لِبَاسَہُمَا لِیُرِیَہُمَا سَوۡاٰتِہِمَا ؕ﴾ ”اے بنی آدم! کہیں یہ شیطان تمہیں بھی اسی طرح فتنے میں مبتلا نہ کر دے جیسا کہ اس نے تمہارے والدین (حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام) کو جنّت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس اُن سے اُتروا دیے تھے تاکہ ان کی شرم گاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھول دے۔“ ﴿اِنَّہٗ یَرٰىکُمۡ ہُوَ وَ قَبِیۡلُہٗ مِنۡ حَیۡثُ لَا تَرَوۡنَہُمۡ ؕ﴾ ”وہ اور اس کے ساتھی (یعنی عزازیل نامی جن ابلیس اور اس کے ساتھ اس گروہ کے دوسرے جِنات‘ کیونکہ جِنّوں میں سے اکثریت سرکشوں کی ہے) تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں (تمہیں تاکتے ہیں‘ تم پر حملہ آور ہوتے ہیں) جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔“ یہ جن غیر مرئی ہیں‘ نظر نہیں آتے۔ کوئی انسان دوسرے پر حملہ کرے تو اگر وہ اور کچھ نہ کر سکے تو کم از کم مدافعت کے لیے ہاتھ پاؤں تو مار سکتا ہے اور جس چیز سے بھی حملہ کیا جا رہا ہو اس سے بچاؤ کی کوئی نہ کوئی تدبیر کر سکتا ہے‘ لیکن اس شخص سے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی کہ جو نظر ہی نہ آ رہا ہو؟ چنانچہ یہ جن تو ایسی جگہ سے حملہ کرتے ہیں کہ ان کو دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ ﴿اِنَّا جَعَلۡنَا الشَّیٰطِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ لِلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۷﴾﴾ ”ہم نے ان شیطانوں کو دوست اور پشت پناہ بنا دیا ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان نہیں لاتے۔“ چنانچہ ایمان سے تہی دست لوگ کہ جو اللہ پر‘ فرشتوں‘ آخرت‘ کتابوں اور نبیوں پر ایمان نہیں رکھتے‘ پوری طرح سے شیطان کے قابو میں ہوتے ہیں کہ وہ انہیں جس کھائی میں چاہے جا کر پٹخ دے‘ جس کنوئیں میں چاہے لے جا کر پھینک دے‘ کیونکہ انہوں نے ایمان نہ لا کر خود شیطان کو اپنا ولی اور پشت پناہ بنا لیا ہوتا ہے۔

بنی آدم کے لیے ابلیس کا چیلنج

مذکورہ بالا آیات سورۃ الاعراف میں وارد ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مضمون قرآن مجید میں مزید تین مقامات پر شیطان کے چیلنج کے ساتھ آیا ہے‘ جبکہ سات میں سے بقیہ تین مقامات پر یہ واقعہ تو بیان ہوا ہے‘ لیکن شیطان کا چیلنج ذکر نہیں ہوا۔

سورۂ بنی اسرائیل (آیات ۶۱ تا ۶۵) میں یہی بات ذرا مزید وضاحت کے ساتھ آئی ہے۔ وہاں ابلیس کے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کے بعد اس کے الفاظ نقل ہوئے ہیں:
﴿قَالَ اَرَءَیۡتَکَ ہٰذَا الَّذِیۡ کَرَّمۡتَ عَلَیَّ ۫ لَئِنۡ اَخَّرۡتَنِ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَاَحۡتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۶۲﴾﴾ ”شیطان نے کہا کہ پروردگار! یہ جو تُو نے اس آدم کو مجھ پر برتری دی ہے تو اگر تُو مجھے قیامت کے دن تک کے لیے مہلت دے دے تو میں اس کی اولاد کو ڈھانٹی دے دوں گا (یعنی جیسے گھوڑے یا کسی جانور کے مُنہ کے اندر لوہے کی کوئی شے باندھ دی جاتی ہے اور پھر اسے کسی بھی طرف لے جایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ شیطان نے یہ کہا کہ مَیں انہیں ڈھانٹی دے دوں گا اور پھر جدھر چاہوں گا لے جاؤں گا) بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے۔“

﴿قَالَ اذۡہَبۡ فَمَنۡ تَبِعَکَ مِنۡہُمۡ فَاِنَّ جَہَنَّمَ جَزَآؤُکُمۡ جَزَآءً مَّوۡفُوۡرًا ﴿۶۳﴾﴾ ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اچھا دفع ہو جا! ان میں سے جو بھی تمہاری پیروی کرے گا تو پھر جہنّم ہی تم سب کے لیے بھرپور بدلہ ہوگا۔“ ﴿وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡہُمۡ بِصَوۡتِکَ وَ اَجۡلِبۡ عَلَیۡہِمۡ بِخَیۡلِکَ وَ رَجِلِکَ وَ شَارِکۡہُمۡ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ﴾ ”ان انسانوں میں سے جس کے معاملے میں بھی تیرے لیے ممکن ہو اُسے (صراطِ مستقیم سے) اپنی چیخ و پکار اور اپنی آوازوں سے ڈگمگانے کی کوشش کر اور ان پر چڑھالا اپنے سوار اور اپنے پیادے بھی‘ اور ان کے مال اور اولاد میں مشارکت کر لے۔“ چنانچہ جب مال حرام طریقے سے کمایا جاتا ہے تو شیطان ایسے مال کے اندر حصّہ دار بن جاتا ہے‘ اور جب اولاد زنا کے ذریعے سے پیدا ہو تو شیطان ایسی اولاد کے اندر شریک ہو جاتا ہے۔ ﴿وَعِدۡہُمۡ ؕ وَ مَا یَعِدُہُمُ الشَّیۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۶۴﴾﴾ ”اور ان سے وعدے کر (یعنی انہیں سبز باغ دکھا) اور شیطان کے وعدے تو ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔“

﴿اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ ؕ﴾ ”(یہ بات سمجھ لے کہ) بے شک میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار نہیں ہوگا۔“ تُو انہیں زبردستی غلط راستے پر نہیں لے جا سکتا۔ صرف وسوسہ اندازی کر سکتا ہے‘ بُرائی کو مزیّن کر کے دکھا سکتا ہے‘ اخلاق باختہ تہذیب کو ثقافت کے نام پر دنیا میں عام کر سکتا ہے‘ لیکن زبردستی کسی کو راہِ ہدایت سے ہٹا کر کفر اور شرک کی حالت میں نہیں لے جا سکتا۔ ﴿وَ کَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیۡلًا ﴿۶۵﴾﴾ ”اور کافی ہے (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کا

رب کارساز کے طور پر۔'' وہ اپنے بندوں کی مدد اور سہارے کے لیے کافی ہے' کیونکہ وہی ان کا پشت پناہ اور دوست ہے۔

دو اور سورتوں یعنی الحجر اور ص میں تقریباً ایک جیسے الفاظ میں یہ مضامین آئے ہیں۔

﴿قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿٣٤﴾﴾ (الحجر) ''اللہ نے فرمایا کہ (اے ابلیس!) نکل جا یہاں سے' کیونکہ تُو مردود ہے (لعنت زدہ ہے)۔''

یہ آیت دونوں مقامات پر جوں کی توں آئی ہے۔

﴿وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿٣٥﴾﴾

''اور اب جزا و سزا کے دن تک کے لیے تجھ پر لعنت ہے۔''

یہ تو سورۃ الحجر میں فرمایا' لیکن سورۃ ص میں ایک لفظ کا فرق ہے: ﴿وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿٧٨﴾﴾ ''اور اب تجھ پر میری لعنت جزا و سزا کے دن تک رہے گی۔'' ﴿قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٧٩﴾﴾ شیطان نے کہا کہ پروردگار! مجھے مہلت دے دے اُس دن تک کے لیے کہ جس دن تُو انہیں دوبارہ اٹھائے گا۔'' ﴿قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿٨٠﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٨١﴾﴾ ''فرمایا: تمہیں مہلت دے دی گئی اُس معلوم وقت کے دن تک کے لیے۔''

یہ تینوں آیات سورۃ الحجر اور ص میں بالکل ایک ہی طرح دہرائی گئی ہیں۔ ﴿قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٣٩﴾﴾ ''اُس نے کہا کہ پروردگار! جیسا کہ تُو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب مَیں ان کے لیے زمین میں دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو لازماً بہکا دوں گا۔'' یہ بھی اسی طرح کے الفاظ ہیں جو سورۃ الاعراف میں آئے ہیں۔

قرآن حکیم میں سورۃ الکہف کے حوالے سے یہ بات آئی ہے کہ انسان کی دل فریبی کے لیے سب سے بڑی چیز زمین کی زیبائش' اس کی چمک دمک اور اس کی رونقیں' دولت' عمارات اور ساز و سامان ہے کہ آدمی جن کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو جاتا ہے۔ یوں وہ دُنیا کا اور اس کے ظواہر کا پرستار بن جاتا ہے۔ ابلیس نے یہ بات بڑی زور دے کر کہی تھی کہ ﴿وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝﴾ ''اور مَیں ان سب کو ضرور اغوا اور گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔''

سورۂ ص میں ﴿رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ کے الفاظ نہیں ہیں'

بلکہ وہاں فرمایا: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾﴾ ''(اے پروردگار!) مَیں تیری عزّت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مَیں ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا۔'' ﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾﴾ ''سوائے ان میں سے تیرے اُن بندوں کے جنہیں تُو نے اپنے لیے خاص کر لیا ہو''۔ یعنی ان پر تو میرا اختیار نہیں ہوگا' باقی پوری نوعِ انسانی کو میں ڈھانٹی دے دوں گا۔

مذکورہ بالا بیان سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے نزدیک یہ مضمون کتنا اہم ہے کہ سات مقامات پر اس واقعے کا ذکر آیا ہے اور پھر سات میں سے چار مقامات پر شیطان کے اس واضح چیلنج کا ذکر آیا ہے کہ مَیں نوعِ انسانی کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ وہ تکبّر کی وجہ سے گمراہ ہوا اور آدم کے مقام و مرتبہ اور عزّت کی وجہ سے اس کے اندر حسد پیدا ہوا۔ یہی دو بنیادی بیماریاں ہیں کہ جن کی وجہ سے اس کے اندر نوعِ انسانی کے لیے شدید دشمنی ہے' چاہے اس دشمنی میں اس کا اپنا فائدہ نہ ہو۔ چنانچہ یہی چیز معلوم بھی ہوتی ہے کہ اس کا اس میں اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے' لیکن اپنے غصے اور حسد کی وجہ سے نوعِ انسانی کی دشمنی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ سورۃ فاطر میں فرمایا:

﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ﴾ (آیت ۶)

''بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے' تو تم بھی اُسے دشمن ہی خیال کرو۔''

اور سورۃ الکہف میں ارشاد فرمایا:

﴿أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۚ﴾

(آیت ۵۰)

''کیا تم نے شیطانِ لعین اور اس کی ذریت کو مجھے چھوڑ کر دوست بنا لیا ہے' حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔''

چنانچہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اس دنیا میں انسان دشمنی کے سارے ہتھکنڈے یعنی بدی' شر' برائی' بے حیائی کی ترغیب یہ سب گویا شیطان کی اسی مہلت کا مظہر ہے کہ جو اُس نے اللہ تعالیٰ سے لی ہوئی ہے' اور وہ اس مہلت کو اسی کام کے لیے پوری طرح سے استعمال کر رہا ہے۔

حزبُ الشیطان بمقابلہ حزب اللہ

مزید یہ نوٹ کیجیے کہ اس ابلیس کے ساتھ ایک فوج بھی ہے' جسے قرآن مجید میں کہا گیا ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ﴾ ''یہ شیطان کی پارٹی ہیں۔'' شیطان اکیلا نہیں ہے۔ ایک تو وہ عزازیل یا ابلیس ہے جس کو اللہ نے طویل عمر دے دی' وہ تو قیامت تک رہے گا۔ باقی جِنّات بھی جو اُس کی نسل میں سے یا اُس کی نوع میں سے ہیں' بہت طویل عمر رکھتے ہیں۔ جِنّات کے علاوہ وہ اپنی فوج میں انسانوں میں سے بھی رنگروٹ بھرتی کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال منافقین مدینہ ہیں' جو بظاہر حضور ﷺ کا کلمہ پڑھنے والے تھے' حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے والے تھے' اسلام کا دعویٰ کرنے والے تھے' لیکن ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾ (المجادلۃ) ''یہی ہیں شیطان کی پارٹی کے لوگ' اور آگاہ رہو کہ شیطان کی پارٹی والے ہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔'' اس کے مقابلے میں اللہ کی پارٹی ہے۔ جو اُس کے مخلص بندے ہیں وہ اللہ کی پارٹی ہے اور جو شیطان کے مرید بن گئے' اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لی' وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں' چاہے وہ جِنّات میں سے ہوں یا انسانوں میں سے۔ بلاشبہ انسانوں میں سے بھی ایک بہت بڑی تعداد اُس کے حزب میں یعنی اُس کی پارٹی میں شامل ہے۔ وہ اُس کے ایجنٹ ہیں' بلکہ ان میں بہت سے تو ایسے بھی ہیں جو شیطنت میں جِنّات کے بھی کان کترتے ہیں اور ان کو بھی شیطنت کا سبق پڑھا سکتے ہیں۔

انسان دشمنی میں ابلیس کے خصوصی ایجنٹ: یہودی

دُنیا میں ایک نسل اور قوم بھی ایسی ہے جو ایک خاص وقت سے من حیث القوم ابلیس کی ایجنٹ بن گئی' اور وہ یہودی ہیں۔ ابلیس کی سرکشی کے دونوں بنیادی عنصر' یعنی تکبّر اور حسد' اس قوم میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہ بات تو یہودی قوم کی فطرت میں موجود تھی کہ صرف ہم (یہودی) اصل انسان ہیں' باقی لوگ انسان نما حیوان ہیں' ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ غیر یہودی ان کے نزدیک goyims اور gentiles ہیں' گویا حیوانات ہیں۔ جیسا انسانوں کو حق ہے کہ حیوانوں سے خدمت لیں اور انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کریں' اسی طرح یہودی باقی نوعِ انسانی کو exploit کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ گھوڑے کے پسینے اور محنت کی کمائی ٹانگہ چلانے والا کھاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ چونکہ اگلے روز اسے پھر جوتنا ہے لہٰذا وہ اپنی کمائی میں سے کچھ نہ کچھ تو اسے بھی کھلائے گا۔ یہودیوں کا یہ مستقل قول ہے کہ اصل انسان ہم ہیں' باقی نوعِ انسانی ہمارے لیے

حیوانوں کے درجے میں ہے۔ ہم جیسے چاہیں ان کو استعمال کریں' انہیں دھوکا دیں' انہیں لوٹیں کھسوٹیں' بدعہدی کریں' ان سے سود لیں' ان کے استحصال کا جو بھی ممکن طریقہ ہو وہ ہم استعمال کریں' یہ ہمارا حق ہے۔ ایک تو اس اعتبار سے یہود باقی تمام نوعِ انسانی کے دشمن بن گئے۔

مدینہ میں آباد یہودی باقی اہلِ عرب کو اُمّی کہا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان کے پاس کتاب یعنی تورات تھی' اور کسی کے پاس کتاب موجود نہیں تھی۔ لہٰذا یہودی کہا کرتے تھے کہ یہ اَن پڑھ ہیں' جاہل ہیں' اُمّی ہیں' جبکہ ہم صاحبِ کتاب ہیں۔ ہم ان اُمیوں کے ساتھ جس طرح کا بھی معاملہ کریں' ہمارے اوپر کوئی گرفت نہیں ہوگی ﴿لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ﴾ (آلِ عمران: ۷۵) اللہ تعالیٰ ہم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ تم نے ان کے ساتھ وعدہ خلافی کیوں کی تھی؟ تم نے ان کو دھوکا کیوں دیا تھا؟ تم نے ان کا مال کیوں ہڑپ کر لیا تھا؟ ہم پر اس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ تو اس اعتبار سے انسانیت کی دشمنی ان کی گھٹی میں پڑ گئی۔ اس غلط خیال کی وجہ سے ان میں گھمنڈ پیدا ہو گیا کہ ہم تو بخشے بخشوائے ہیں' اللہ کے چنیدہ ہیں'

We are the chosen people of the Lord

ہمیں تو اگر اللہ تعالیٰ جہنّم میں داخل بھی کرے گا تو گنتی کے چند دن۔ ہم تو اللہ کے پسندیدہ ہیں' اُس کے بیٹوں میں سے ہیں' بڑے چہیتے ہیں ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ﴾ (المائدۃ: ۱۸)۔ باقی انسان تو ہمارے خدمت گار ہیں' ہم جیسے چاہیں ان سے کام لیں اور جس طرح چاہیں ان کو ہڑپ کر جائیں۔

حضرت مسیحؑ کی بعثت اور یہود کا طرزِ عمل

یہ تو ان کا پہلے سے مستقل معاملہ تھا' لیکن اس کے بعد ان کی تاریخ میں وہ دور آیا جب حضرت مسیح علیہ السلام ان میں مبعوث کیے گئے۔ یہ یہود کی تاریخ کا کلائمکس ہے۔ یہ چودہ سو سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اُس وقت سے بعثتِ مسیح تک اللہ کا وہ فضل اُن پر ہوا کہ اُس کے دوران کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا کہ اُن کے ہاں کوئی نبی موجود نہ ہو۔ گویا نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں۔ اس تار کے آغاز پر بھی دو نبی تھے' حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اور چودہ سو برس کے بعد آخر میں پھر دو نبی ہیں' حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام۔ اس عرصے میں اتار چڑھاؤ بہت سے آئے' لیکن اِس وقت قبل مسیح کی تاریخ میرا موضوع نہیں ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں اس کا تذکرہ موجود ہے

کہ بنی اسرائیل پر دو مرتبہ عذاب کے کوڑے برسے۔ پہلے اشوریوں کے ذریعے سے‘ جو سامی تھے‘ اور پھر بابلیوں یعنی عراقیوں کے ذریعے سے۔ اس کے بعد پھر دوسرا دور آیا اور ان کی خرمستیاں بڑھ گئیں تو پہلے یونانیوں کے ذریعے سے اور پھر رومیوں کے ذریعے سے ان پر عذاب کا کوڑا برسا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے قبل ان پر دو عروج کے دور اور دو زوال کے دور گزر چکے تھے۔ (بنی اسرائیل کے عروج و زوال کا پورا نقشہ آپ کو میری چھوٹی سی کتاب ’’تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر‘‘ میں مل جائے گا۔ مزید برآں یہ مباحث میری تالیف ’’سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی‘ حال اور مستقبل‘‘ میں تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔)

بہرحال ان کا یہ چودہ سو سالہ دور اُونچ نیچ سے ہوتا ہوا جب حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت پر پہنچا تو اُن کی شرارت کی انتہا ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا تھا ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ (آلِ عمران:۴۹)۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان رسول کوئی نہیں ہے‘ سب نبی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ رسول تھے اور پھر حضرت عیسیٰؑ رسول تھے۔ حضرت یحییٰؑ بھی نبی تھے‘ رسول نہیں تھے‘ لہٰذا وہ شہید کر دیے گئے جبکہ رسول شہید نہیں ہوسکتا‘ قتل نہیں ہوسکتا۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے درمیان چودہ سو برس میں اس کا نقطۂ عروج حضرت مسیح کی بعثت ہے۔ حضرت مسیحؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی روح اور اپنا کلمہ قرار دیا‘ انہیں عظیم ترین معجزات عطا کیے‘ لیکن یہود نے نہ صرف ان کی تکذیب کی بلکہ انہیں‘ معاذ اللہ‘ ولد الزنا قرار دیا۔ ان کے بارے میں کہا گیا (نقل کفر کفر نباشد) کہ یہ جادوگر ہے‘ یہ مرتد ہے‘ یہ واجب القتل ہے۔

فلسطین میں اُس وقت اصل حکومت رومیوں کی تھی‘ لیکن انہوں نے یہودیوں کو خود مختاری دے رکھی تھی کہ اپنے مذہبی معاملات تم خود طے کر سکتے ہو۔ چنانچہ یہودیوں کی اُس وقت کی سب سے بڑی عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ مسیح (علیہ السلام) کو سُولی پر چڑھا دیا جائے۔ وہ خود اس فیصلے پر عمل درآمد نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ رومن گورنر Pilatis Pontis کے پاس ان کی عرضداشت پہنچ گئی کہ ہمارا یہ مذہبی مجرم واجب القتل ہے‘ اسے سُولی چڑھا دو۔ اُس نے پانی منگوا کر اپنے ہاتھ دھوئے کہ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی جرم نہیں ہے‘ تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے اس کو سولی چڑھا دیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا اور ان کی جگہ وہ شخص (جو ڈاس اسکریوٹ) سولی چڑھا دیا گیا جس نے غداری کر کے انہیں گرفتار کروایا تھا۔

اللہ نے اس کی شکل حضرت مسیحؑ جیسی بنا دی تھی۔ حضرت مسیحؑ ایک باغ میں جس کوٹھڑی کے اندر روپوش تھے اس کی چھت پھٹی‘ چار فرشتے آئے اور حضرت مسیحؑ کو اٹھا کر لے گئے۔ پھر چھت برابر ہوگئی۔ اس کے بعد وہ شخص پکڑا گیا اور سولی دے دیا گیا۔ یہ ساری تفاصیل نہ تو قرآن میں ہیں نہ حدیث میں‘ بلکہ یہ ’’انجیل برنباس‘‘ میں ہیں۔ سینٹ برنباس حواریینِ مسیح میں سے تھے‘ لیکن عیسائی ان کی بائبل کو کلیسا کے قواعد و ضوابط کے مطابق شرعی (Canonical) نہیں مانتے۔ ایک دَور میں عیسائیوں کے ہاں ایک سو چار اناجیل ہوا کرتی تھیں‘ جن میں سے انہوں نے قرعہ اندازی کے ذریعے چار یعنی متی‘ مرقس‘ لوقا اور یوحنا کی اناجیل کو شرعی (Canonical) قرار دے لیا‘ باقی ایک سو اناجیل کو وہ شرعی تسلیم نہیں کرتے۔ انہی میں سے ایک انجیل برنباس ہے۔ بہرحال حضرت مسیح علیہ السلام کو تو اللہ نے آسمان پر اٹھا لیا لیکن اُس دن سے اس قومِ یہود کو مغضوب علیہم قرار دے دیا گیا۔

رسولوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا ضابطہ

رسولوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی اُمّت کسی رسول کی جان کے درپے ہو جاتی تھی تو اس اُمّت کو نسیاً منسیاً کر دیا جاتا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو اسی قاعدے کے تحت ختم کیا گیا۔ حضرت ہود علیہ السلام کی نگاہوں کے سامنے قومِ عاد برباد کی گئی‘ حضرت صالح علیہ السلام کی نگاہوں کے سامنے قومِ ثمود برباد ہوئی۔ سدوم اور عامورہ کی بستیاں جہاں حضرت لوط علیہ السلام بھیجے گئے‘ مدین کا علاقہ جہاں حضرت شعیب علیہ السلام بھیجے گئے اور آلِ فرعون جن کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا‘ سب کے سب ہلاک کر دیے گئے۔ نبیوں کے بارے میں یہ بات نہیں ہے۔ نبی آیا‘ اُس نے دعوت دی۔ جس نے مان لیا اپنے لیے اچھا کیا‘ نہیں مانا تو اُس کی اپنی عاقبت برباد ہوگئی۔ دنیا میں اس کا کوئی فیصلہ نہیں چکایا جاتا۔ لیکن رسولوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی عدالت بن کر آتے ہیں کہ مانو گے تو بچو گے‘ نہیں مانو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ اس اعتبار سے یہودی اس کے مستحق تو ہو چکے تھے کہ انہیں ہلاک کر دیا جاتا‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی کوئی خصوصی مشیت اور حکمت ہے (اس کے بارے میں بعد میں عرض کیا جائے گا) جس کی رو سے اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو تو زندہ اٹھا لیا اور یہود کی رسّی ابھی مزید دراز کر دی۔ ان کو مہلت دے دی کہ تمہارا آخری عذابِ استیصال ابھی مؤخر کیا جا رہا ہے۔ قرآن اس کو ’’عذابِ اکبر‘‘ کہتا ہے۔ سورۃ السجدۃ میں (جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ کو فجر کی پہلی رکعت میں تلاوت فرمایا کرتے تھے) فرمایا

گیا ہے: ﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١﴾﴾ ''اس بڑے عذاب سے پہلے ہم (اسی دنیا میں) کسی نہ کسی چھوٹے عذاب کا مزہ انہیں چکھاتے رہیں گے‘ شاید کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آجائیں۔'' بڑا عذاب یہ ہوتا ہے کہ قوم بالکل برباد کر دی جائے‘ نسیاً منسیاً ہو جائے‘ ﴿كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا﴾ ''جیسے کبھی یہاں آباد تھے ہی نہیں‘‘ اور ﴿لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ﴾ ''اب ان کے صرف مسکن نظر آتے ہیں (مکین نظر نہیں آتے)''۔ یہ عذابِ اکبر یہود پر نہیں آیا‘ حالانکہ وہ اس کے مستحق اُسی وقت ہو گئے تھے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ کسی شخص کو پھانسی کا حکم تو ہو جائے لیکن اس پر فی الفور عمل درآمد نہ کرایا جائے‘ بلکہ execution کچھ وقت کے لیے مؤخر کر دی جائے۔ یہ معاملہ ہوا اس قوم کے ساتھ۔

ابلیس اور یہود کا گٹھ جوڑ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک اور موقع دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے چھ سو برس بعد محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت ہوئی۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ اس قوم پر اللہ کا بہت بڑا فضل تھا کہ اب پھر انہیں ایک موقع دیا گیا اور خبردار کیا گیا کہ: ﴿عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا﴾ (الاسراء:۸) ''تمہارا ربّ اب بھی تم پر رحم فرمانے کو تیار ہے‘ لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا کا اعادہ کریں گے۔'' مزید فرمایا: ﴿إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ﴾ ''یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اُس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے''۔ اس قرآن کے سائے میں آجاؤ۔ یہ ہدایت میں آنے کا شاہ درہ ہے‘ اس میں داخل ہو جاؤ۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تصدیق کرو‘ دامنِ محمدیؐ کے سائے میں آجاؤ‘ اب بھی ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے۔ لیکن اس قوم نے حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دشمنی پر کمر کس لی۔

یوں سمجھیے کہ اس تاریخ سے آج تک یہ ابلیس اور یہود کا گٹھ جوڑ ہے۔ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان نہیں لائے وہ تو کافر ہیں‘ جہنمی ہیں‘ لہٰذا ان پر کوئی مزید محنت صرف کرنے کی ابلیس کو ضرورت ہی نہیں۔ اب اس کا اصل ٹارگٹ اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ گویا اُس کے لیے ساری بنی نوعِ آدم کی دشمنی اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر آکر مرکوز ہو گئی ہے۔ اسی طرح یہود کا معاملہ ہے کہ اگرچہ وہ پوری نوعِ انسانی کے دشمن ہیں‘ انہیں حیوان سمجھتے ہیں‘ لیکن اب ان کی دشمنی کا سب سے بڑا مرکز بھی اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہی تکبّر اور حسد کی ابلیس والی

بیماریاں انہیں بھی لاحق ہیں۔ انہیں تکبّر یہ ہو گیا تھا کہ نبوت تو دو ہزار سال سے ہماری جاگیر ہے۔ بنی اسرائیل کے اندر سینکڑوں نبی آئے‘ تین تین کتابیں ہمیں اللہ نے عطا کیں۔ یہ کہاں سے آ گیا محمد؟ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ!) اُمّیّین میں سے‘ gentiles میں سے‘ goyims میں سے ایک رسول مبعوث ہو گیا؟ کہاں ہم کہاں یہ! ہم نہیں تسلیم کریں گے۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے: ﴿يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ﴾ (البقرۃ:۱۴۶) کہ ان کے علماء آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایسے پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے کہ یہ آخری نبی ہیں۔ لیکن تکبّر اور حسد کی آگ میں جل اٹھے۔ اب ان کی دشمنی بھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہے۔

یہود کی دو ہزار سالہ تاریخ کا اجمالی جائزہ

اب مَیں انسانوں میں سے ابلیس لعین کے سب سے بڑے آلۂ کار بلکہ شراکت دار‘ یہود ملعون‘ جن کا انسان دشمنی میں سب سے بڑا کردار ہے‘ ان کی حضرت مسیح علیہ السلام سے آج تک کی دو ہزار سالہ تاریخ کا نقشہ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے چودہ سو سال کے تو چار پوائنٹس بتائے گئے‘ یعنی دو مرتبہ عروج اور دو مرتبہ زوال۔ پہلے دورِ زوال میں اشوریوں کے ہاتھوں پٹائی اور پھر بابلیوں کے ہاتھوں پٹائی‘ جبکہ دوسرے دورِ زوال میں پہلے یونانیوں اور پھر رومیوں کے ہاتھوں مرمت۔ اب حضرت مسیح علیہ السلام کو بیس صدیاں پوری ہو گئی ہیں اور اکیسویں صدی شروع ہو گئی ہے۔ پہلے یہ نوٹ کیجیے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سن ایک قبل مسیح ہے۔ یہ نکتہ آپ نے کبھی سنا ہے یا نہیں؟ پچھلے سال جب ملینیم (millennium) کا سلسلہ شروع ہوا تھا تو میں نے بیان کر دیا تھا کہ اس حساب کے اندر انہوں نے ایک عجیب غلطی کی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش ۲۵ دسمبر کو ہوئی۔ اس کے بعد جنوری آئی تو پہلا عیسوی سال شروع ہو گیا۔ اگر جنوری سے پہلا سال شروع ہوا تو یہ جو چھ دن ہیں وہ پچھلے سال میں تھے۔ لہٰذا کہا جائے گا کہ

Jesus Christ was born one year before Christ.

تو ایک قبل مسیح میں حضرت مسیحؑ کی پیدائش ہوئی۔ یہ آخری اسرائیلی نبی اور رسول تھے۔ یہودی علماء نے آپ علیہ السلام کی جس طرح مخالفت کی اور دشمنی پر اتر آئے‘ وہ مَیں بیان کر چکا ہوں۔

۳۳ء میں جبکہ حضرت مسیح علیہ السلام کی عمر تقریباً ۳۳ برس تھی‘ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا‘ لیکن یہودیوں نے اپنے خیال کے مطابق انہیں سولی پر چڑھوا دیا اور ان کی موت واقع ہوگئی۔ اس بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں کا اختلاف ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ وہ سُولی پر چڑھ گیا‘ ختم ہوگیا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ نہیں‘ مسیح کا صلیب پر انتقال ہوا‘ لیکن پھر وہ زندہ ہو گئے۔ ان کی میّت ایک غار میں رکھ دی گئی تھی‘ وہیں ان کا بعث بعد الموت ہوگیا اور پھر انہیں اللہ نے زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ لہٰذا ہمارے اور عیسائیوں کے درمیان یہ چیز مشترک ہے کہ حضرت مسیحؑ آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے۔ فرق یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ سُولی دیے گئے‘ سُولی پر فوت ہوئے‘ پھر زندہ ہوئے اور آسمان پر اٹھائے گئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ ’’نہ وہ انہیں صلیب دے سکے اور نہ انہیں قتل کر سکے‘‘ ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ﴾ (النساء:۱۵۸) ’’بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا۔‘‘ پھر ہمارا اور عیسائیوں کا ایک اور اتفاق حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کے بارے میں ہے۔ یہ عیسائیوں کا بھی عقیدہ ہے اور ہمارا بھی عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ آئیں گے۔

بہرحال اُس وقت یہودی عذابِ استیصال کے مستحق ہو چکے تھے‘ لیکن اللہ نے ان کی مدّت دراز کی ہے۔ تاہم اُن پر دنیوی عذاب کا ایک کوڑا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسی وقت برسا‘ اور حضرت مسیحؑ کے رفع سماوی کے ۳۷ برس بعد ۷۰ء میں یہودیوں نے رومیوں کے خلاف بغاوت کی۔ اس کی پاداش میں رومی جنرل ٹائٹس نے حملہ کیا تو ایک لاکھ تینتیس ہزار (۱۳۳۰۰۰) یہودی ایک دن میں یروشلم میں تہ تیغ کیے گئے اور ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ وہ ہیکل آج تک گرا پڑا ہے۔ زندہ بچ جانے والے یہودیوں سے کہہ دیا گیا کہ اس ارضِ فلسطین سے نکل جاؤ‘ تم اب یہاں نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا جس کا جہاں سینگ سمایا‘ چلا گیا۔ کچھ یورپ میں چلے گئے‘ کچھ افریقہ جا بسے‘ کچھ ایشیا میں آ گئے۔ ان کے تین قبیلے بنوقینقاع‘ بنونضیر اور بنوقریظہ مدینہ میں آ کر آباد ہو گئے۔ اُس وقت یہ پوری دنیا میں تتر بتر ہو گئے۔ اس دور کو وہ اپنا ’’دورِ انتشار‘‘ (Diaspora) کہتے ہیں۔ اس لفظ میں یہ بات مضمر ہے کہ ہماری اصل سرزمین فلسطین ہے۔ حضرت ابراہیمؑ‘ حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کا مسکن فلسطین ہی تھا۔ لہٰذا یہود کے نزدیک فلسطین ان کی جدی پشتی جاگیر ہے۔ یہود کا دورِ انتشار ۱۹۱۷ء تک جاری رہا۔ اس دورِ انتشار کے

چند حصوں کو علیحدہ علیحدہ سمجھ لیں۔

سلطنتِ روما میں یہودیوں کی زبوں حالی

دورِ انتشار کا پہلا حصّہ تقریباً ۳۰۰ برس پر محیط ہے جب دنیا کے بہت بڑے حصّے پر رومی حکمران مسلّط تھے۔ وہ یہودیوں کے بھی دشمن تھے اور عیسائیوں کے بھی۔ اگرچہ عیسائی اور یہودی ایک دوسرے کے بھی دشمن تھے‘ لیکن رومی سمجھتے تھے کہ یہ ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ رومیوں کے نزدیک عیسائی بھی یہودیوں ہی کا ایک فرقہ تھے‘ یہ کوئی علیحدہ مذہب نہیں تھا۔ لہٰذا رومی ان دونوں کو ستاتے اور تشدد کا نشانہ بناتے‘ جبکہ یہ آپس میں بھی لڑتے تھے۔ یہودی عیسائیوں کو مارتے تھے اور عیسائی یہودیوں کو مارتے تھے۔ یہ ہے ان کی تین سو برس کی تاریخ!

۳۰۰ء میں ایک معجزہ ہوگیا کہ سلطنتِ روما کے شہنشاہ قسطنطین اعظم نے عیسائیت قبول کر لی۔ اب معاملہ بالکل تلپٹ ہوگیا اور پوری سلطنت عیسائی ہوگئی۔ چنانچہ اب عیسائیوں کے عیش ہو گئے اور یہودیوں کو مار پڑنی شروع ہوئی‘ ان کا قافیہ تنگ ہوگیا۔ ذرا سوچئے کہ عیسائی جنہیں خدا بنائے بیٹھے ہیں‘ خدا کا بیٹا قرار دے رہے ہیں‘ ان کے ’’قاتل‘‘ یہودی بدمعاش تھے۔ لہٰذا یورپ میں ان کی وہ پٹائی شروع ہوئی کہ رہے نام اللہ کا۔ پوری سلطنتِ روما میں انہیں ذلیل کیا گیا‘ شہروں میں ان کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی گئی اور یہودی کا نام ایک گالی بن گیا۔ آج بھی ہمارے ہاں یہودی کا لفظ گالی ہے۔ اُس دَور میں عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین انتہائی شدید دشمنی پیدا ہوگئی‘ جسے قرآن کہتا ہے: ﴿فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ (المائدۃ:۱۴) ’’پس ہم نے اُن کے مابین قیامت تک کے لیے عداوت اور دشمنی پیدا کر دی۔‘‘

آنحضور ﷺ کی بعثت اور یہود کا معاندانہ رویّہ

یہودیوں کا دورِ انتشار شروع ہونے کے پورے پانچ سو برس بعد ۵۷۱ء میں محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی اور ۶۱۰ء میں آپؐ پر وحی کا آغاز ہوا۔ حضور ﷺ کے ساتھ ان کا معاملہ یہ رہا کہ ابھی آپؐ مکّہ میں ہی تھے تو یہودیوں نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ وہ حضور ﷺ کے خلاف قریشِ مکّہ کو سکھاتے پڑھاتے تھے کہ ان سے یہ پوچھو! انہیں اس طرح تنگ کرو! ان کا یہ امتحان لو! سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں ان کے امتحانی سوالات مذکور

ہیں۔ مثلاً: ذوالقرنین کون تھا؟ اصحابِ کہف کون تھے؟ روح کی حقیقت کیا ہے؟ اس طرح یہ مدینہ میں بیٹھے ہوئے ساری ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے تو آپؐ نے انتہائی مدبرانہ انداز سے وہاں آباد یہودیوں سے مشترکہ دفاع کا معاہدہ کر لیا۔ یعنی اگر مکّہ والے ہم پر حملہ کریں گے تو ہم مل جل کر ایک قوم کی حیثیت سے ان کا مقابلہ کریں گے۔ یہ ''میثاقِ مدینہ'' کہلاتا ہے' جس کو آج کل بہت غلط معانی پہنائے جا رہے ہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ہر مرتبہ یہود خیانت کے مرتکب ہوئے۔ انہوں نے عہد کی خلاف ورزی کی اور اندر ہی اندر سازشوں کی پالیسی اپنائی۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۳ میں فرمایا گیا ہے: ﴿لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کے علم میں ان کی طرف سے ہمیشہ خیانتیں اور بددیانتیاں ہی آتی رہیں گی۔'' ان کے دلوں میں محمد رسول اللہ ﷺ کے خلاف دشمنی کے جذبات عروج پر تھے اور وہ بار بار جنگ کی آگ بھڑکاتے تھے۔ قریش کو دعوت دیتے تھے کہ آؤ! تم باہر سے حملہ آور ہو جاؤ' ہم اندر سے بغاوت کریں گے اور اس طرح ہم ختم کر دیں گے محمد کو اور اہلِ ایمان کو (ﷺ و رضوان اللہ علیہم اجمعین)۔ لیکن پھر جب وہ جنگ کے لیے آتے تھے تو یہ دبک جاتے تھے۔ ان میں ہمت نہیں تھی' یہ میدان کے مرد نہیں تھے۔ سورۃ الحشر میں ان کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ان کے اندر کھلے میدان میں مقابلے کی صلاحیت ہی نہیں ہے: ﴿لَا يُقٰتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ﴾ (آیت ۱۴) ''یہ کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہ کریں گے' لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔'' بہرحال قرآن مجید میں ہے کہ وہ گاہے بگاہے جنگ کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتے رہتے۔ سورۃ المائدۃ آیت ۶۴ میں ہے: ﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ﴾ ''جب بھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔'' اکثر و بیشتر مواقع پر تو جب یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے تھے اللہ اسے بجھا دیتا تھا' لیکن بہرحال اس کے باوجود جنگیں ہوئیں۔ غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد کے پس منظر میں اصل شرارت انہی کی تھی۔ ان جنگوں کے نتیجے میں حضور ﷺ نے پھر ایک ایک کر کے ان تینوں قبیلوں کو سزا دی۔ غزوۂ بدر (۲ھ) کے فوراً بعد بنوقینقاع مدینہ سے نکالے گئے' غزوۂ اُحد (۳ھ) کے فوراً بعد بنونضیر نکالے گئے اور غزوۂ احزاب (۵ھ) کے بعد بنوقریظہ

کے ساتھ نمٹا گیا۔ یہ ان کی تاریخ کا دوسرا دور ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں یہودیوں کا جو رویّہ تھا اس کے بارے میں سورۃ المائدۃ آیت ۸۲ میں فرمایا گیا: ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا﴾ ''تم اہلِ ایمان کی عداوت میں شدید ترین یہودیوں کو اور مشرکین کو پاؤ گے۔'' یہاں اہلِ ایمان سے یہود کی دشمنی کو مشرکین سے مقدم رکھا گیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بیت المقدس کی فتح

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا گیا۔ شہر کی فصیل بڑی اونچی تھی اور اہلِ شہر سامانِ خورد و نوش وغیرہ کے معاملے میں خود کفیل تھے۔ حملے کا راستہ بھی کوئی نہ تھا۔ محاصرہ طول کھینچ رہا تھا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ظہور یوں ہوا کہ عیسائیوں کے کچھ علماء فصیل پر آئے اور کہا: دیکھو مسلمانو! تم قیامت تک بھی ہمارا محاصرہ کر کے یہاں پڑے رہو گے تب بھی یہ شہر فتح نہیں ہوگا۔ ہاں' یہ شہر ایک درویش بادشاہ کے ہاتھوں فتح ہونا ہے جو ہمیں تمہارے اندر نظر نہیں آ رہا۔ امیرِ لشکر اَمِیْنُ هٰذِهِ الْاُمَّة ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا ذہن فوراً ادھر گیا کہ وہ درویش بادشاہ تو مدینے میں بیٹھا ہوا ہے' یعنی عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔

اب ایک اور عمر بھی ہے جو قندھار میں بیٹھا ہے۔ سادگی کی حد تک نقشہ وہی ہے۔ اسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ عمرِ اوّل عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ عمر ثانی عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ۔ اب اللہ کے فضل سے یہ ملا محمد عمر مجاہد ہیں جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اَیَّدَهُ اللّٰهُ بِنَصْرِهٖ۔ اللہ تعالیٰ ان کی نصرت فرمائے اور دشمنوں کو ان کے مقابلے میں نیست و نابود کر دے۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے امیر المؤمنین کی خدمت میں درخواست بھیج دی کہ آپ تشریف لائیے' یہ شہر فتح ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک خادم اور ایک اونٹ کے ہمراہ مدینہ منورہ سے چل پڑے۔ یہ ہے وہ تاریخی سفر کہ سات سو میل کی طویل مسافت اس شان سے طے ہوتی ہے کہ ایک منزل امیر المؤمنین اونٹ پر بیٹھے ہیں اور خادم آگے چل رہا ہے اور اگلی منزل پر خادم اوپر بیٹھا ہے اور امیر المؤمنین آگے چل رہے ہیں۔ جب بیت المقدس کے قریب پہنچے تو باری خادم کی تھی۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے کہ خدا کے لیے آپ اونٹ پر سوار ہو جائیں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ تمہیں شرم نہیں آتی' امیر المؤمنین آگے نکیل پکڑ کر پیدل چل رہے ہیں اور تم اوپر براجمان ہو! حضرت

عمرؓ نے فرمایا: اَلدَّور دَورک ''باری تمہاری ہے۔'' اس حال میں بیت المقدس پہنچے ہیں۔ ابوعبیدہؓ بن الجراح استقبال کے لیے آئے تو دیکھا کہ امیر المؤمنین اسی حال میں اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ کہیں کیچڑ وغیرہ سے جوتے خراب ہو گئے تھے تو وہ بھی ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔ کپڑے تو تھے ہی پھٹے ہوئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا کہ یہ بڑا متمدن اور مہذب ملک ہے۔ آپ ذرا اپنا حلیہ درست فرمالیں' تب جا کر یہ آپ کو شہر کا قبضہ پیش کریں گے۔ آپؓ نے فرمایا: نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰہُ بِالْاِسْلَامِ کہ ہم وہ قوم ہیں جنہیں اللہ نے عزّت ہی اسلام کے ذریعے سے دی ہے۔ کپڑوں کے ذریعے سے نہیں' دولت کے ذریعے سے نہیں۔ عیسائی علماء نے فصیل کے اوپر کھڑے ہو کر نشانیاں دیکھیں اور اپنی کتابیں کھول کر کہنے لگے کہ ہاں یہی وہ درویش بادشاہ ہے۔ اس کے بعد شہر کے دروازے کھول دیے گئے۔ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا اور بیت المقدس فتح ہو گیا۔

اُس وقت حضرت عمرؓ نے ایک نرمی یہ کی کہ اسے یہودیوں کے لیے بھی کھلا شہر قرار دے دیا۔ یہ اُن پر حضرت عمرؓ کا احسانِ عظیم تھا۔ اس سے پہلے یہودی وہاں داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے اور اپنے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت تک نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ۵۵۰ برس بعد ان کے لیے راستہ کھولا کہ تم یہاں آ سکتے ہو اور زیارت کر سکتے ہو۔ لیکن عیسائیوں نے معاہدے کے اندر یہ لکھوایا کہ آپ یہودیوں کو یہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ آئیں' زیارت کریں اور واپس چلے جائیں۔ خلافت راشدہ کے بعد بنواُمیّہ اور پھر بنوعباس نے بھی حضرت عمرؓ کے اس معاہدے کی مکمل پاس داری کی۔ جب خلافت ترکوں کے پاس آئی تو ترک خلفاء نے بھی اس معاہدے کی پوری پابندی کی کہ یہودی فلسطین میں آ سکتے ہیں' لیکن صرف زائرین کی حیثیت سے' وہاں آباد نہیں ہو سکتے۔

حضرت عثمانؓ کا دورِ خلافت اور یہود کی ریشہ دوانیاں

حضرت عثمانؓ کا دورِ خلافت آیا تو اب یہود نے اُمّتِ مُسلمہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ ایک یہودی عبداللہ بن سبا اسلام کا لبادہ اوڑھ کر آیا اور معاشرے کا جائزہ لیا۔ اس نے دیکھا کہ بنوہاشم اور بنواُمیّہ میں جو بہت پرانی کشاکش تھی' اس کے کچھ نہ کچھ جراثیم باقی ہیں۔ اگر ان کو ذرا بھڑکا دیا جائے تو مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوگا۔ چنانچہ اس نے اس طرح کی باتیں اٹھانی شروع کیں

کہ یہ عثمان کون ہے! یہ تو بنواُمیّہ میں سے ہے' جبکہ خلافت کا حق بنوہاشم کا ہے' خلافت ان کے پاس ہونی چاہیے' محمد ﷺ کے رشتہ دار تو وہ ہیں۔ عوام الناس کے اندر ایسی باتیں پھیلنی شروع ہو گئیں۔

پھر ایک بڑی سازش کے انداز میں حضرت عثمانؓ اور ان کے عاملین (گورنرز) کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا اور آپؓ پر اقربا پروری اور بددیانتی کے الزامات کی خوب تشہیر کی گئی۔ اس کام میں یہ لوگ ایسی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے کہ جہاں جاتے وہاں کے حاکم کے خلاف کچھ نہ کہتے' بلکہ دوسرے علاقوں کی باتیں کرتے۔ کوفہ میں وہاں کے حاکم کے خلاف کچھ نہیں کہنا لیکن پروپیگنڈا یہ کرنا کہ مصر میں یہ ہو رہا ہے' شام میں یہ ہو رہا ہے' مدینہ میں یہ ظلم ہو رہا ہے' لوٹ مار ہو رہی ہے' یہ خیانتیں ہو رہی ہیں۔ اُس زمانے میں آج کی طرح کے وسائل و ذرائع تو تھے نہیں کہ دوسرے علاقوں سے تصدیق کر لی جاتی۔ دوسرے' فطرتِ انسانی کی یہ کمزوری ہے کہ انسان بری بات فوراً قبول کرتا ہے' جبکہ کسی کے بارے میں اچھی بات ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ فتنہ انہوں نے اٹھایا۔

اسی دوران حضرت علیؓ کی الوہیت کا فتنہ اٹھا دیا گیا۔ الغرض ''الفتنۃ الکبریٰ'' برپا کر دیا گیا' جس میں حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔ اس کے بعد وہ باہمی خانہ جنگی ہوئی کہ پانچ برس تک مسلمان ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے رہے۔ اس فتنے نے اُمّت کو وہ زخم لگایا جس سے آج تک خون رس رہا ہے۔ یہ شیعانِ عثمانؓ اور شیعانِ علیؓ تھے جو بعد میں بالترتیب سُنّی اور شیعہ ہو گئے' اور آج تک ہیں۔ یہ فتنہ کس نے جگایا؟ ایک یہودی عبداللہ بن سبا اور اس کے کارندوں نے جو شیطان کے ایجنٹ تھے۔

مسلم ہسپانیہ میں یہود کا کردار

اگلا دور آیا۔ خلافت راشدہ ختم ہوئی' بنواُمیّہ کا دور بھی کافی گزر گیا۔ طارق بن زیاد ۷۱۲ء میں سپین پر حملہ کرتے ہیں۔ سپین اُس وقت عیسائیت کا بہت بڑا گڑھ تھا اور وہاں بڑے کٹر عیسائی آباد تھے۔ لہٰذا یہودیوں کی وہاں بہت پٹائی ہوتی تھی' کیونکہ ان کی پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اس حوالے سے یہودیوں نے اُس وقت چالاکی یہ برتی کہ سپین پر حملہ میں طارق بن زیاد کی مدد کی اور انہیں راستے وغیرہ بتائے۔ اس پر طارق بن زیاد نے انہیں اپنا محسن سمجھا۔ ہسپانیہ فتح ہو گیا تو یہودی چونکہ محسنین کی فہرست میں آ گئے تھے لہٰذا مسلمانوں نے ان کو خوب مراعات سے نوازا۔

ان کے بڑے بڑے علماء اور دانش ور اُسی دَور کے اندر پیدا ہوئے۔ بن گوریان جو اسرائیل کا ایک وزیراعظم تھا' اس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

''Muslim Spain was the golden era of our Diaspora.''

یعنی ان کا دورِ انتشار جو ۷۰ء سے شروع ہوا تھا اور ۱۹۱۷ء تک جاری رہا' اس میں ان کا سنہری دور مسلم ہسپانیہ کا دور تھا۔ لیکن وہاں انہوں نے اور جو کچھ کیا یہ ایک الگ داستان ہے' جس کے بہت سے گوشے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر انہوں نے عیسائیت کی پیٹھ میں چھرا گھونپا کہ پروٹسٹنٹ مذہب پیدا کر کے عیسائیت کو تقسیم کر دیا۔ جیسے عبداللہ بن سباء نے مسلمانوں میں شیعہ سُنّی کی تقسیم کی اسی طرح یہودیوں نے عیسائیوں میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی تقسیم کر دی۔ ہسپانیہ کے بڑے بڑے شہروں غرناطہ' قرطبہ' طلیطلہ وغیرہ میں عظیم یونیورسٹیاں قائم تھیں' جہاں علم حاصل کرنے کے لیے نوجوان فرانس' جرمنی اور اٹلی سے آتے تھے۔ وسطی یورپ کے یہ تین ہی ملک ہیں جو قریب ترین پڑتے ہیں۔ اسلام جو روشنی پھیلا رہا تھا وہ یہاں کی یونیورسٹیوں سے وسطی یورپ میں پھیل رہی تھی اور ان کی جہالت کے پردے چھٹ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں پر موجود یہودی یہاں آنے والے نوجوانوں کے اندر عیسائیت کے خلاف بغاوت کے جراثیم پھیلا رہے تھے۔

اُس وقت دنیا میں جو بھی عیسائیت تھی وہ دراصل پوپ کا راج تھا۔ ایک طرف بادشاہ تھے' لیکن ان کی حیثیت یوں سمجھ لیجیے کٹھ پتلیوں کی تھی۔ اصل اختیارات پوپ کے ہاتھ میں تھے اور اس کو انہوں نے وہ درجہ دے رکھا تھا جس کے لیے قرآن حکیم میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۳۱) ''انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا ربّ بنا لیا ہے۔'' سینٹ پال نے شریعتِ موسوی ساقط کر دی تھی۔ پوپ کو اختیار تھا کہ جس چیز کو چاہے حلال قرار دے دے اور جسے چاہے حرام قرار دے دے۔ لیکن انہوں نے کہا یہ پوپ کس بلا کا نام ہے! یہ بھی تو ہماری طرح کا ایک انسان ہے۔ اصل حیثیت تو کتاب کی ہونی چاہیے۔ ہمارے پاس آسمانی کتاب موجود ہے اور کتاب ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔ پوپ اور پادریوں کے لیے کوئی خصوصی حقوق نہیں اترے کہ صرف وہی کتاب پڑھ سکتے ہیں بلکہ اسے ہم بھی پڑھ سکتے ہیں' ہم بھی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ باتیں تھیں جن کو یہودیوں نے بڑھا چڑھا کر بیان کر کے پوپ کا اقتدار ختم کرا دیا اور توجہ بائبل کی طرف مرکوز کر دی۔ بائبل میں بڑا

حصّہ تو عہد نامہ قدیم (Old Testament) پر مشتمل ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹس کے نزدیک یہود کی عظمت مسلّم ہو گئی کہ اصل قوم (بنی اسرائیل) تو یہ ہے۔ تورات موسیٰ کو دی گئی تھی اور موسیٰؑ کے اُمّتی یہ ہیں' ابراہیمؑ کی نسل یہ ہیں۔ لہٰذا عیسائیوں کے دلوں میں ان کے خلاف جو دشمنی اور عداوت تھی کہ ہمارے خدا کو سولی چڑھانے والے یہ بدمعاش ہیں' اس پروٹسٹنٹ مذہب کے نتیجے میں اس کا ازالہ ہو گیا۔

عیسائیت خوں خوار ترین مذہب کیسے بنا؟

واضح رہے کہ جو ''Old Testament'' ان کے ہاتھ آئی وہ تو محرف تھی۔ اصل تورات تو ۵۸۷ قبل مسیح میں گم ہو گئی تھی جب پہلی مرتبہ ہیکل سلیمانی تباہ ہوا۔ اس کے کوئی ۱۵۰ سال بعد انہوں نے یادداشتوں سے مرتب کر کے تورات لکھی۔ چنانچہ اب اس میں ان کے اپنے خیالات' اپنے امانی (wishful thinkings) اور اپنی توجیہات شامل ہو گئیں۔

اہلِ کتاب نے اپنے سیاہ کارناموں' مظالم' قتلِ عام اور حرام کاریوں کو جواز بخشنے کے لیے تورات میں مَن چاہی تبدیلیاں کیں اور پیغمبروں پر ظلم و ستم' دہشت ناکی اور بدترین حرام کاریوں کے الزامات لگائے۔ ذرا چند ایک حوالے ملاحظہ کیجیے کہ اس کتاب کے اندر مظالم کی کس طرح تعلیم دی گئی ہے۔

(۱) ''اس لیے ان بچوں میں جتنے لڑکے ہیں سب کو مار ڈالو اور جتنی عورتیں مَرد کا منہ دیکھ چکی ہیں ان کو بھی قتل کر ڈالو! لیکن ان لڑکیوں کو جو مَرد سے واقف نہیں اور اچھوتی ہیں اپنے لیے زندہ رکھو۔'' (گنتی ۱۳:۱۷' ۱۸)

کیا یہ اللہ کی کسی کتاب کا جملہ ہو سکتا ہے؟ کسی الہامی کتاب میں یہ بات کہی جا سکتی ہے؟

(۲) ''پر اُن قوموں کے شہروں میں جن کو خداوند تیرا خدا میراث کے طور پر تجھ کو دیتا ہے کسی ذی نفس کو جیتا نہ بچا رکھنا' جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا ہے ان کو نیست کر دے۔ مَرد' عورتیں' بچے' بوڑھے سب۔'' (استثناء ۲۰:۱۶ تا ۱۸)

(۳) ''اور داؤد نے اس سرزمین کو تباہ کر ڈالا اور عورت مَرد کسی کو جیتا نہ چھوڑا۔''

(سموئیل ۷ ۹:۲)

(۴) ''ان سب آباد شہروں کو مع عورتوں اور بچوں کے بالکل نابود کر ڈالا۔'' (استثناء ۳:۶)

اس کے علاوہ اس کا ایک نتیجہ وہ نکلا جسے برٹرینڈ رسل نے بیان کیا ہے:

"The Christians, retaining the judaic belief in a special revelation, added to it the Roman desire worldwide dominion and the Greek taste for metaphysical subtlties. The combination produced the most fiercely persecuting religion that the world has yet known."

(In Praise of Idleness, p.108)

برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ عیسائیت میں آ کر یہ تین چیزیں شامل ہوگئیں:

(۱) ظلم و بربریت کی تعلیم جو مذہب کے نام پر دی گئی۔ یہ ''کتابِ مقدّس'' کی تعلیم ہے۔

(۲) رومیوں کے اندر پوری دنیا پر غالب آنے کی جو ایک تمنّا تھی وہ عیسائیت کے اندر منتقل ہوگئی' اس لیے کہ پوری رومی سلطنت عیسائی ہوگئی اور اسے وراثت کے اندر یہ چیز مل گئی۔

(۳) انہوں نے یونانیوں کے توہمات کو بھی اپنے ہاں مختلف شکلوں کے اندر جمع کر لیا۔

ان تین چیزوں کے اشتراک کے نتیجے میں معلوم تاریخ انسانی کے اندر جو بدترین خوں خوار ترین مذہب ہوسکتا ہے' وہ شکل عیسائیت نے اختیار کر لی۔ اور اس کا مظہرِ اتم تھا صلیبی جنگیں!! ٹائم لائن کے اعتبار سے ایک بات نوٹ کر لیجیے گا کہ جب ان کا پہلا ملینیم ختم ہوا اور دوسرا شروع ہوا تو گیارھویں صدی میں پہلی صلیبی جنگیں ہوئیں' جن میں لاکھوں مسلمان قتل ہوئے۔ صرف یروشلم کے اندر مسلمانوں کا اتنا زیادہ خون بہایا گیا کہ خود ان کے تاریخ دان لکھتے ہیں کہ صلیبی جب اپنے گھوڑوں پر شہر کی گلیوں میں چل رہے تھے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک خون کی ندی بہہ رہی تھی۔ جہاں سے گزرے مسلمانوں کو ختم کرتے چلے گئے' آبادیوں کی آبادیاں ختم ہوگئیں۔ اگرچہ اس موقع پر گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسا اور بہت سے یہودی بھی مارے گئے' لیکن صلیبی جنگوں کا اصل ہدف مسلمان تھے۔ اربن ثانی پوپ نے پورے یورپ کے اندر آگ لگا دی تھی کہ شرم سے ڈوب مرو' تمہارے مقدّس علاقے مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں جو کافر اور ملحد ہیں۔ جہاں مسیح پیدا ہوا' جہاں مسیح کو سولی دی گئی وہ سرزمین ان کے ہاتھ میں ہے! چنانچہ یہ لوگ فرانس اور جرمنی سے تین ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے وہاں آئے۔ انہوں نے جو تباہی مچائی' تاریخ انسانی میں ایسی بربریت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ سب ان کے اپنے مؤرخین لکھتے ہیں اور ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لکھتے ہوئے شرم کے مارے ان کی گردنیں جھکی جاتی ہوں۔

فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں

پوپ کے خلاف سب سے پہلے بغاوت کرنے والا ملک انگلستان تھا۔ اس نے ''چرچ آف انگلینڈ'' کے نام سے اپنا علیحدہ چرچ بنا لیا اور پوپ سے رشتہ منقطع کر لیا۔ انگلستان دنیا میں سب سے پہلی پروٹسٹنٹ مملکت تھی۔ WASP یعنی White Anglo-Saxon Protestants میں اوّلیت کا شرف برطانیہ کو حاصل ہے۔ یہاں پر یہودیوں نے بہت بڑا کارنامہ یہ کیا کہ یورپ پر سے پوپ کی گرفت کمزور ہوئی اور پروٹسٹنٹ مذہب کا فروغ ہوا تو انہوں نے سود کی اجازت حاصل کر لی۔ جب تک پوپ کی حکومت تھی' عیسائیت میں سود حرام تھا۔ اس کے بعد یہود House of Rothchilds اور House of Goldsmith جیسے بڑے بڑے بینک بنا کر بیٹھ گئے۔

انہوں نے سازشوں کے ذریعے یورپ میں مختلف ملکوں کے درمیان جنگیں کروائیں۔ جنگ کی آگ بھڑکا دینا اُن کا پرانا مشغلہ تھا۔ جنگ چھڑ جانے کے بعد فرانس کے بادشاہ کو بھی اسلحہ کے لیے قرض چاہیے تھا اور انگلستان کے بادشاہ کو بھی۔ یہود کا ایک نمائندہ یہاں بیٹھا تھا اور ایک نمائندہ وہاں' جو جنگ کے دونوں فریقوں کو منہ مانگی شرح سود پر قرض دے رہے تھے۔ اس طرح یہودیوں نے یورپ کے سارے مالی وسائل کھینچ لیے اور ان کی دولت پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند سو سال کے اندر فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں آ گئی۔ علّامہ اقبال ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک وہاں رہے تھے اور ان کی نگاہ تیز یہ سب کچھ دیکھ چکی تھی ؎

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں!

انہوں نے ادراک کر لیا کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے!'' اُس وقت ابھی ہٹلر کا وجود بھی نہیں تھا۔ بعد میں اسے بھی محسوس ہوگیا کہ واقعتاً ہمارا اصل دشمن یہودی ہے جو یہاں آ کر بیٹھا ہوا ہے اور ہمارا خون چوس رہا ہے۔ آخر یونہی تو اس نے یہود کا قتل عام (Holocaust) شروع نہیں کر دیا تھا۔ اس نے انہیں پہچان لیا تھا' اس لیے کہ وہ WASP میں سے نہیں تھا۔ یہود کا اصل جادو WASP پر چلا ہے۔ برطانیہ ان کا سب سے بڑا پشت پناہ' مددگار اور حامی بن گیا۔

سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف یہودی سازشیں

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ترک خلفاء پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ ترکی اُس وقت یورپ کا مردِ بیمار بن چکا تھا اور ترکی خلافت زوال سے دوچار ہو چکی تھی۔ ترک خلفاء بے چارے اس قانونِ فطرت کی زد میں آ چکے تھے جو اقبال کے اس شعر میں بیان ہوا ہے ؎

مَیں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر!

انہوں نے بڑے بڑے قرضے لے کر محلات بنائے' جو آج استنبول میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہودیوں نے انہیں بڑی سے بڑی رشوت پیش کی کہ کسی طرح ہمیں فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دیں' لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو معاہدہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اس کو ہم نہیں بدل سکتے۔ تم جاؤ' جا کر زیارت کرو' لیکن تم وہاں آباد نہیں ہو سکتے۔ فلسطین کا علاقہ اس وقت تک ترکی کے زیرنگیں تھا اور سلطنتِ عثمانیہ میں شامل تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ پورے مغربی ایشیا' مشرقی یورپ اور شمالی افریقہ یعنی تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ چار سو برس تک خلافت ان کے ہاں رہی ہے۔ انہوں نے یہودیوں کی پیشکش قبول نہیں کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہودیوں نے خلافت کے نظام کو ختم کرنے کی سازش شروع کر دی۔

اسی سازش کے آثار دیکھ کر ہندوستان میں تحریک خلافت چلائی گئی تھی۔ ؎

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو!
ساتھ ہیں تیرے شوکت علی بھی جان بیٹا خلافت پہ دے دو!

یہ تحریک اُس وقت چلی تھی جب خلافت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی' لیکن نظر آ گیا تھا کہ اسے ختم کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ جب شیخ الہندؒ مالٹا میں اسیر تھے (۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک) تو کیمپ کا انگریز کمانڈنٹ ان سے بہت متاثر تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ یہ بہت فرشتہ صفت انسان ہے' نُورانی شکل وصورت ہے' تو ان سے اچھا میل ملاپ تھا۔ ایک روز شیخ الہندؒ نے اُس سے کہا: آپ ہماری خلافت کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ وہ تو ایک نیم مردہ شے ہے' اس میں جان تو ہے نہیں۔ یہ ایک نشانی ہے' اسے آپ کیوں برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں؟ اس پر اُس نے کہا: حضرت اتنے بھولے نہ بنیے! ہمیں معلوم ہے کہ اس نیم مردہ خلافت میں بھی اتنی طاقت ہے کہ اگر اس نے جہاد کا فتویٰ دے دیا تو

انڈونیشیا سے موریطانیہ تک مسلمان سر پر کفن باندھ کے نکل آئیں گے۔ لہٰذا ہمیں اسے ختم کرنا ہی کرنا ہے۔

اور ختم کس سے کرایا؟ ایک فری میسن مصطفیٰ کمال پاشا سے۔ ؎

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ' اوروں کی عیاری بھی دیکھ!

یہ عیاری یہود کی اور ان کے آلہ کار برطانیہ کی تھی۔ ابھی خلافت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ یہود نے ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے ذریعے بالفور ڈیکلریشن کی رو سے یہ حق حاصل کر لیا کہ وہاں جا کر آباد بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں سلطنتِ عثمانیہ ختم ہو گئی تھی اور اب خلافت محض نام کی رہ گئی تھی' جس کے تحت صرف ترکی رہ گیا تھا۔ جنرل ایلن بی کی فوجیں یروشلم میں داخل ہو چکی تھیں اور وہاں برطانیہ کا قبضہ ہو چکا تھا' جبکہ قبضہ دلوانے والی فوجوں میں ہمارے ہندوستان کے مسلمان فوجی بھی شامل تھے۔ دوسری طرف عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور انگریز کا ساتھ دیا۔

بالفور ڈیکلریشن اور اسرائیلی ریاست کا قیام

یروشلم پر برطانیہ کا قبضہ ہوا تو برطانوی وزیرخارجہ بالفور نے اعلان کر دیا کہ یہودیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چاہیں تو فلسطین میں آباد ہو سکتے ہیں۔ یہ ۱۹۱۷ء کا اعلان ہے۔ اس کے بعد یہود نے وہاں آباد ہونے کے لیے جو طریقے برتے ان میں دھن' دھونس' دھاندلی' دھوکا ہر چیز شامل ہے۔ مثلاً کسی فلسطینی سے پوچھا: آپ یہ مکان بیچیں گے؟ اُس نے آمادگی ظاہر کی تو منہ مانگی قیمت سے بھی زیادہ ادائیگی کر کے اس سے فی الفور مکان خالی کرا لیا۔ دولت کی ان کے ہاں کمی نہیں تھی۔ پورے یورپ کا سرمایہ یہودی بینکرز کے پاس تھا۔ صیہونی تحریک اصل میں بینکرز ہی کی تحریک تھی۔ ۱۸۹۷ء میں جن لوگوں نے جمع ہو کر اس تحریک کے پروٹوکول بنائے تھے وہ سب یہی بینکرز تھے۔ اسی طرح فلسطینیوں سے ان کے کھیت اور باغات بھی خرید لیے گئے۔ دولت کے علاوہ دھونس' زبردستی بھی کی گئی اور اہلِ فلسطین کو جبراً بھی وہاں سے بے دخل کیا گیا۔

۱۹۴۸ء میں جب اسرائیلی ریاست قائم ہو گئی تو اسرائیلیوں نے اپنی عدالتوں میں اس طرح کے استغاثے دائر کرنے شروع کر دیے کہ فلاں مکان دو ہزار سال پہلے میرے فلاں جدِ امجد کا تھا جس پر اب مسلمان قابض ہیں۔ ایسے استغاثوں کے ساتھ جعلی دستاویزات بھی

عدالت میں پیش کر دی جاتیں اور عدالت ان کی بنیاد پر یہودیوں کے حق میں فیصلہ دے کر فلسطینیوں کو وہاں سے بے دخل کر دیتی۔ مسئلہ فلسطین میں سب سے بڑا کردار برطانیہ نے ادا کیا اور دوسرے نمبر پر امریکہ رہا۔ اب نمبر ایک امریکہ ہے۔ لیکن WASP کا امام چونکہ برطانیہ ہے' اس لیے وہ اب بھی اسرائیل کا بہت بڑا وکیل ہے۔

اسرائیل کے قیام سے قریباً نو ماہ قبل اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا۔ اس میں اللہ کی جو حکمت نظر آتی ہے' وہ مَیں بعد میں عرض کروں گا۔

عرب اسرائیل جنگیں

پہلی عرب اسرائیل جنگ ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ اس میں عرب جیت رہے تھے کہ اچانک پتا نہیں کیوں عربوں نے جنگ بند کر دی۔ یہ بالکل متوازی واقعہ ہے' ۱۹۴۸ء میں کشمیر میں ہم جیت رہے تھے کہ نہرو بھاگ کر UNO کے اندر پہنچ گیا اور جنگ بند ہو گئی۔ اس میں کچھ اپنوں کی غلطی بھی تھی۔ ہمارے قبائلی جو سری نگر ایئرپورٹ تک پہنچ گئے تھے' بجائے اس پر قبضہ مکمل کرنے کے لوٹ مار میں لگ گئے' لیکن اس کے باوجود ہمارا پلڑا بھاری تھا اور اگر سری نگر ایئرپورٹ پر قبضہ ہو گیا ہوتا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ بھارت وہاں اپنی فوجیں اتار سکتا۔ زمینی راستہ تو تھا ہی نہیں۔ یہی کچھ فلسطین میں بھی بڑے عجیب طریقے پر ہوا ہے۔ عرب جیت رہے تھے' اسرائیلی شکست کھا رہے تھے' مگر عربوں نے صلح کر لی۔ کچھ مہینوں کے بعد عربوں نے دوبارہ جنگ کی' لیکن اسرائیل کی دہشت گردی کے آگے ان کی ہمت جواب دے گئی۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں عرب ہار گئے۔

۱۹۶۷ء میں روس کے سکھانے پڑھانے پر جمال عبدالناصر نے حملہ کیا اور ایلات کی بندرگاہ کی ناکا بندی کر دی۔ لیکن چھ دن کی جنگ میں اسرائیلیوں نے مصر سے پورا صحرائے سینا لے لیا' شام سے جولان کی پہاڑیاں لے لیں اور اُردن سے نہ صرف پورا مغربی کنارا بلکہ مشرقی یروشلم بھی چھین لیا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ یروشلم پورا کا پورا یہودیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں یروشلم تقسیم کر دیا گیا تھا کہ مغربی یروشلم یہودیوں کے پاس اور مشرقی یروشلم مسلمانوں کے پاس رہے۔ مشرقی یروشلم ہی میں مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ ہے جو مسلمانوں کی تحویل میں تھے۔ اس علاقے پر اردن کا قبضہ تھا' لیکن ۱۹۶۷ء میں پورا یروشلم اسرائیل کے قبضے میں آ گیا۔

بہرحال رمضان ۱۹۷۳ء کی جنگ میں مصر نے بدلہ لینے کی ایک کوشش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصریوں نے بڑی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور Bar Lev لائن عبور کر لی' جبکہ اسرائیلی سمجھتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی اس دفاعی لائن کو عبور نہیں کر سکتی۔ لیکن پھر جب امریکہ اپنی پوری طاقت لے کر میدان میں آ گیا تو حالات بالکل بدل گئے۔

مذہبی اور سیکولر یہودیوں کی باہمی کشاکش

یہ ہے وہ مختصر سی تاریخ جو مَیں نے آپ کے سامنے رکھی ہے۔ اب جو اصل مسئلہ ہے وہ سمجھئے کہ منظر کیا ہے! یہ وہ پہلو ہیں کہ شاید بہت سے حضرات کی نگاہوں میں نہ ہوں۔ باقی تو یہ تاریخ کے واقعات ہیں' اکثر لوگوں کے علم میں ہوں گے۔

یہودیوں میں بھی ایک بڑی شدید اندرونی کشاکش ہے' جیسا کہ مسلمانوں میں ہے۔ کچھ مسلمان وہ ہیں جو نماز روزے کی پابندی کرتے ہیں اور انہیں دین سے تعلّقِ خاطر ہے' جبکہ کچھ لوگ وہ ہیں کہ جنہیں نماز روزے سے کوئی سروکار نہیں۔ ذہن سیکولر ہیں۔ مادہ پرستی ان کا وطیرہ ہے۔ ایسا ہی ان یہودیوں کے ہاں بھی ہے۔ اصل عملی یہودی کے سر کے اوپر اونچا کالا ہیٹ ہوتا ہے' ان کی زلفیں لمبی لمبی ہوتی ہیں' خاص طور پر کنپٹی کے بالوں اور قلموں سے بڑا خوبصورت سا ہار بناتے ہیں' لمبا کالا کوٹ پہنا ہوتا ہے اور لمبی داڑھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں مسلمانوں میں سے بھی جس کی لمبی داڑھی ہوتی تھی اسے یہودی سمجھا جاتا تھا۔ عرب میں لمبی داڑھی یہودی رکھتا تھا' مسلمان نہیں۔ ایک انتہا پر تو یہ ہیں۔ دوسری انتہا پر وہ ہیں کہ جنہیں کسی شے سے کوئی غرض نہیں۔ شراب بھی پیتے ہیں' سود بھی کھاتے ہیں۔ ان میں بینکرز بھی ہیں' بڑے بڑے سائنس دان بھی ہیں۔ یہ زیادہ تر سیکولر ذہن کے مالک ہیں۔ کچھ بیچ بیچ میں بھی ہیں' جیسے ایریل شیرون کی داڑھی تو نہیں ہے لیکن سر پر ضرور ایک ٹوپی سی چپکی ہوئی نظر آ جائے گی۔ یہ درمیانی یہودی ہونے کا نشان ہے کہ ایک شعار انہوں نے اپنا برقرار رکھا ہوا ہے۔ ان کے ہاں زیادہ تر کشمکش سیکولر اور مذہبی لوگوں کے مابین ہے' جسے آپ rightists اور leftists کی کشمکش کہہ سکتے ہیں۔

ایک چیز تو ان دونوں کے درمیان قدرِ مشترک ہے کہ پوری دنیا کی مالیات پر ہمارا تسلط ہوگا۔ ہم dominate کریں گے اور دوسرے لوگوں کو ہم حیوان بنا کر رکھ دیں گے۔ ہماری ملٹی نیشنل کمپنیاں ہوں گی' انہی کا راج ہوگا' انہی کی حکومتیں ہوں گی' انڈسٹری انہی کے ہاتھ میں ہوگی

اور لوگ مزدوروں کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ان میں سے تھوڑے سے منیجرز لے کر ان کو بھی ہم تنخواہ دے دیں گے‘ باقی یہ کہ سود کے ذریعے سے ملائی ہم کھینچتے رہیں گے‘ مکھن ہمارے پاس آتا رہے گا۔ دنیا پر یہ مالیاتی تسلط تو دونوں کے نزدیک متفق علیہ چیز ہے۔

اس کے بعد ان کے مابین ایک اختلاف ہے۔ مذہبی یہودی یہ کہتا ہے کہ ہم نے گریٹر اسرائیل بنانا ہے جس میں وہ سارے علاقے شامل کرنے ہیں جو ان کی تاریخ میں اسرائیلی سلطنت کا حصّہ رہے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے زمانے میں یہودی مصر میں جا کر ڈیلٹا کے علاقے میں آباد ہوئے جو زرخیز ترین علاقہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ علاقہ ہمارا ہے‘ ہم وہاں کئی سو برس تک رہے ہیں۔ صحرائے سینا ہمارا ہے‘ اس میں کوہِ طور ہے‘ جس پر حضرت موسیٰؑ اللہ سے ہم کلام ہوئے تھے اور یہیں پر ہمیں تورات ملی تھی۔ یہاں صحرائے تیہہ ہے جس میں ہم چالیس برس تک بھٹکتے پھرے ہیں۔ پھر فلسطین تو ہماری جدی پشتی جائیداد ہے۔ حجاز کا علاقہ بھی مدینے سمیت ہمارا ہے۔ ہمارے قبیلوں کو وہاں سے مسلمانوں نے نکالا تھا۔ پورا عراق ہمارا ہے‘ پورا شام ہمارا ہے اور ترکی کا بھی ایک ابتدائی علاقہ (جنوب مشرقی) ہمارا ہے۔ یہ ہے گریٹر اسرائیل کا نقشہ جو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے بنانا ہے۔

سیکولر ذہن کے لوگ کہتے ہیں کہ عظیم تر اسرائیل بنا کر تم کیا کرو گے! اس صورت میں عرب تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے۔ وہ تمہیں ماریں گے‘ تم انہیں مارو گے۔ اگر تم ان کے دس مارو گے تو ایک تو وہ بھی تمہارا ماریں گے ہی! اس کے بجائے ہم یہ کرتے ہیں کہ عرب اور اسرائیل مل کر ایک اکنامک یونٹ بناتے ہیں۔ آخر ہم آپس میں کزنز ہیں نا! یہ الفاظ بل کلنٹن نے کہے تھے جب اُس نے شاہ حسین کا اسحاق رابن سے معانقہ کرایا تھا کہ ”You are cousins“۔ یہ دونوں حضرات ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں کی نسل سے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ سے عرب ہیں اور حضرت اسحاقؑ سے بنی اسرائیل ہیں۔ تو جیسے ایشیا پیسفک ایک یونٹ بن گیا ہے‘ آسیان ایک یونٹ بن گیا ہے‘ پورا یورپ ایک یونٹ بن گیا ہے‘ اس کی ایک کرنسی بن گئی ہے‘ اسی طرح ہم مل کر اس پورے علاقے کو ایک یونٹ بناتے ہیں۔ پیسہ عربوں کا ہوگا‘ تیل ان کا ہوگا‘ مزدور اُن کے ہوں گے۔ البتہ مینجمنٹ ہماری ہوگی‘ تکنیکی مہارت ہماری ہوگی‘ سائنس دان ہم ہوں گے۔ چنانچہ ملائی ہم کھاتے رہیں گے‘ چھاچھ ان کو دیتے رہیں گے۔ تو خواہ مخواہ ان کی دشمنی کیوں مول لیں اور زیادہ دشمنی کیوں بڑھائیں؟ یہ

چھوٹے سے اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتے تو گریٹر اسرائیل کو کیسے تسلیم کر لیں گے؟ لہٰذا اس خیال کو دل سے نکال دو۔

مذہبی یہودیوں اور سیکولر یہودیوں میں یہ بہت بڑا اختلاف ہے۔ اس اختلاف میں اتفاق کی ایک صورت یہ پیدا کی گئی ہے کہ امن کے کسی بھی فارمولے کے تحت ہم یروشلم عربوں کو ہرگز نہیں دیں گے۔ یہ اسرائیل کا غیر منقسم دارالخلافہ رہے گا۔ دوسرے یہ کہ مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ کو گرا کر تھرڈ ٹمپل بنائیں گے۔ مذہبی یہودیوں کو اتنی رشوت اگر وہ نہ دیں تو وہ ان کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔

مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کا کردار

امریکہ کا معاملہ یہ ہے کہ ایک طرف وہ پشت پناہ ہے‘ حمایتی ہے‘ محافظ ہے اسرائیل کا۔ اسرائیل کی حیثیت امریکہ ہی کی ایک آؤٹ پوسٹ یا ریاست کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی عالمی مصلحتوں کے پیش نظر اتنی بڑی عرب قوم کو بھی دشمن نہیں بنانا چاہتا۔ وہ جانتا ہے کہ عربوں میں جو اعتدال پسند حکمران ہیں وہ ویسے ہی ان کی جیب میں ہیں‘ جیسے حسنی مبارک اور شاہ فہد ہیں۔ امریکہ کو معلوم ہے کہ اگر ان کی جگہ زیادہ بنیاد پرست لوگ آ گئے تو وہاں امریکہ کی دال نہیں گلے گی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ صلح کے لیے اسرائیل پر دباؤ ڈالتا رہا ہے جبکہ اسرائیل صلح نہیں چاہتا۔ جب خلیج کی جنگ ختم ہوئی تو اُس وقت کے صدر امریکہ جارج بش (موجودہ بش کے باپ) کی مقبولیت کا تناسب امریکہ میں ۸۹ فیصد تھا۔ اس نے اتنی بڑی جنگ میں فتح حاصل کی تھی اور اس میں صرف چند امریکی مرے تھے۔ لیکن اُس نے اسرائیل کے خلاف ایک موقف اختیار کیا تھا جس کی اسے بھاری قیمت چکانی پڑی تھی۔ امریکہ کی طرف سے دس بلین ڈالرز منظور ہو چکے تھے جو اسرائیل کو دیے جانے تھے۔ بش نے کہا کہ مَیں اُس وقت تک یہ رقم جاری نہیں کروں گا جب تک اسرائیل امن کا عمل شروع نہیں کرتا۔ یہ دباؤ تھا جس کے آگے دس بلین ڈالر کی خاطر اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پڑے‘ لیکن انہوں نے اس کا بدلہ یہ چکایا کہ اگلے الیکشن میں بش کو ہرا دیا‘ حالانکہ وہ خلیج کی جنگ کا فاتح تھا اور ۸۹ فیصد ریٹنگ رکھتا تھا۔ اسی طرح بل کلنٹن کا بھی دباؤ رہا کہ کسی طرح صلح کرو۔ اس معاملے میں اُس نے واقعتاً ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ اسی کے دباؤ میں آ کر ایہود باراک جہاں تک چلا گیا تھا‘ اب کوئی نہیں جا سکتا۔ فلسطینیوں کو وہ پیشکش دوبارہ نہیں دی جا سکتی۔

مشرقِ وسطیٰ میں جب امن کا پراسیس شروع ہوا جس کا نام تھا ''Land for Pcacc'' تو اس کے لیے امریکہ نے اصول یہ دیا تھا کہ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں جو زمینیں عربوں سے چھینی تھیں وہ ان کو واپس کر کے ان سے صلح کر لی جائے۔ یہ سب تمہیں تسلیم کر لیں گے اور یوں جنگ ختم ہو جائے گی۔ مصر کو صحرائے سینا دے دو' وہ تم سے صلح کر لے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انور السادات نے صلح کر لی اور اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ شام بھی اس کے لیے تیار رہا ہے لیکن وہ جولان ہائٹس کا پورا علاقہ مانگتا ہے۔ اس علاقے کی سٹرٹیجک اہمیت کچھ ایسی ہے کہ یہودی اسے کسی قیمت پر واپس کرنے کو تیار نہیں' لہٰذا صلح نہیں ہو سکتی۔ شرقِ اردن سے جو علاقہ لیا تھا اس کے بارے میں امریکہ کا اسرائیل کو مشورہ یہ ہے کہ اس کے اندر فلسطینی ریاست بنا دو' اس لیے کہ اس میں فلسطینیوں کی اکثریت ہے۔ اس طرح یہ ایک ریاست در ریاست ہو جائے گی' یعنی اسرائیلی ریاست کے اندر فلسطینی ریاست۔ امن کے عمل کے یہ تین اہم نکات ہیں۔

چوتھی بات یہ بیچ میں آ کر روک دیتے تھے کہ یروشلم کا مستقبل کیا ہو گا' اس حساس معاملے کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔ جب یہ امن مذاکرات شروع ہوئے تو اسحاق رابن کو ایک یہودی نوجوان نے قتل کر دیا۔ اس لیے کہ مذہبی یہودیوں کا یہ کہنا تھا کہ تم عربوں کو یہ زمینیں کیسے واپس دے رہے ہو' ہمیں تو اور زمینیں لینی ہیں۔ تم نے صحرائے سینا واپس کر دیا' ہمیں تو جشن کا سارا علاقہ لینا ہے' جو مصر کا زرخیز علاقہ ہے۔ تم جولان ہائٹس دے رہے ہو' ہمیں پورا شام لینا ہے۔ لہٰذا تم یہ کیسے ''Land for Peace'' کی پالیسی اپنا رہے ہو؟ ہم کوئی زمین واپس نہیں کریں گے' ہمیں تو اور لینی ہیں۔ ایہود باراک تو یہاں تک چلا گیا تھا کہ ہم فلسطینی ریاست بھی مان لیں گے' مشرقی یروشلم بھی دے دیں گے' اس پر تمہارا اقتدار ہو گا' مسجد اقصیٰ بھی تمہارے پاس رہے گی لیکن شمالی حصے میں یہ جو گنبد صخرہ کا علاقہ ہے اس سے دست بردار ہو جاؤ۔ گنبد صخرہ ایک بڑا سا سنہری گنبد ہے۔ یہاں پہلے Temple Mount پہاڑی تھی۔ وہاں ہیکل سلیمانی تھا جو رومیوں نے گرا دیا تھا۔ اسی جگہ سے رسول اللہ ﷺ کو معراج ہوا تو بعد ازاں عبدالملک بن مروان نے وہاں بہت بڑا گنبد بنوایا۔ یہی گنبد صخرہ ہے۔ یہ مسجد اقصیٰ نہیں ہے' مسجد اقصیٰ اس سے الگ ہے۔ یہ ایک بہت بڑا مستطیل شکل کا علاقہ ہے جس کے جنوبی حصے میں مسجد اقصیٰ اور شمالی حصے میں گنبد صخرہ ہے۔ ایہود باراک نے یہاں تک آفر کر دی تھی کہ مسجد اقصیٰ کو تم اپنے پاس رکھ لو' لیکن

ٹمپل ماؤنٹ کے بارے میں ہماری مذہبی یہودیوں کے ساتھ commitment ہے کہ ہم یہاں تھرڈ ٹمپل بنائیں گے۔ یعنی یہاں ہیکل سلیمانی کی تیسری دفعہ تعمیر ہو گی۔ یہ ہے وہ چیز کہ جس کی وجہ سے سارا معاملہ ناکام ہوا۔ ویسے میرا گمان ہے کہ اگر فلسطینی یہ پیشکش قبول بھی کر لیتے تب بھی یہودی اسحاق رابن کی طرح ایہود باراک کو بھی قتل کر دیتے۔ انہیں یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ یروشلم کی تقسیم ہو جائے' اس کا صرف مشرقی حصہ ان کے پاس رہ جائے اور مغربی حصہ عربوں کے پاس چلا جائے۔

آخری اقدام: اسرائیل کا فیصلہ

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مذہبی یہودیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ وزیراعظم ایریل شیرون اگرچہ عملی (practicing) یہودی نہیں ہے' داڑھی والا نہیں ہے' زلفوں والا نہیں ہے' وہی کوٹ پینٹ والا ہے' لیکن سر پر ٹوپی سی ضرور رکھتا ہے۔ یہ انتہائی ظالم اور سفاک ہے۔ اس نے فلسطینیوں کے دو کیمپ ایسے اڑا دیے تھے جیسے کہ چیونٹیوں کا کوئی لشکر ہو اور اسے پاؤں تلے روند دیا جائے۔ یہ بہت بڑا قاتل ہے اور اب اسرائیل کا وزیراعظم ہے۔

اب یہودیوں کا یہ فیصلہ ہے کہ انہیں تین بڑے بڑے قدم اٹھانے ہیں:

(۱) فلسطینیوں کا مکمل خاتمہ: یہود کی سوچ یہ ہے کہ اگر یہ فلسطینی یہاں رہے تو دس ہم ان کے ماریں گے تو دو تین یہ بھی ہمارے ماردیں گے' جبکہ اسرائیلیوں کی جان تو بہت قیمتی ہے۔ فلسطینی اگر ہزاروں بھی مر جائیں تو کوئی بات نہیں۔ یہ تو کیڑے مکوڑے ہیں' gentiles ہیں' goyims ہیں' لہٰذا ان کا ٹنٹا ختم کرو۔ وہ اشتہار شاید آپ کی نظروں سے گزرا ہو گا جس میں مَیں نے یہ الفاظ تحریر کیے ہیں کہ یہودی فلسطینیوں کے خلاف اتنا بڑا اقدام کرنا چاہتے ہیں کہ بوسنیا کی ''نسل کشی'' (ethnic cleansing) ماند پڑ جائے گی اور مسلمانوں کی جو نسل کشی پانچ سو سال قبل ہسپانیہ میں ہوئی تھی اس کا نقشہ سامنے آ جائے گا۔ اُس وقت کیا ہوا تھا؟ فیصلہ کیا گیا کہ عربوں کو یعنی مسلمانوں کو یا تو جلا دو' قتل کر دو' یا انہیں بحری جہازوں میں لے جا کر شمالی افریقہ کے ساحل پر اُتار دو اور وہاں dump کر دو۔ ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ ہوا اور اس کے بعد دس سال کے اندر اندر مسلمانوں کا ایک ایک بچہ تک ختم کر دیا گیا تھا۔ اب اسرائیل کا یہی فیصلہ ہے' اور وہ اپنے آپ کو یہ قدم اٹھانے پر مجبور پاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ فلسطینی کب تک ہمارے لوگوں کو مارتے رہیں

گے! ایک عرب لڑکا بم باندھ کر چلا گیا اور خودکش حملے میں ۱۶ یہودی اڑا دیئے۔ یہ چیز ان کے لیے ناقابل برداشت ہے اور اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔

(۲) مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ کو گرا کر ہیکل سلیمانی کی تعمیر: اب انہیں بہرحال یہ فیصلہ کرنا ہے کہ مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ کو گرا کر وہاں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کریں۔ ایک سال قبل شیرون نے مسجد اقصیٰ کا دورہ کیا تھا اور اس نے تھرڈ ٹمپل کی بنیاد کے طور پر ایک بہت بڑا پتھر وہاں رکھنے کا ارادہ کیا تھا' جس پر فلسطینی نوجوان اینٹ' پتھر اور روڑے لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اُس وقت سے یہ انتفاضہ کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اس میں لاتعداد فلسطینی مارے جا چکے ہیں' کچھ نہ کچھ یہودی بھی مرے ہیں۔ اب وہ اس معاملے کو بالکل ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کا فیصلہ یہ ہے کہ تھرڈ ٹمپل ہر صورت بنا کر رہیں گے۔ لہٰذا اب کئی کئی ٹن وزن کے پتھر تیار کر کے وہاں لا کر رکھ دیے گئے ہیں۔

(۳) مندرجہ بالا فیصلے کرنے کے بعد اسرائیل نے امریکہ کو الٹی میٹم دے دیا ہے کہ تم اب اپنی ٹانگ درمیان میں مت اڑاؤ۔ یہ دھمکی دی ہے کہ تم نے اگر ہمارے معاملے میں رکاوٹ ڈالی تو ہم تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ نیتن یاہو نے کہا تھا کہ میں واشنگٹن کو آگ لگا دوں گا۔ اب انہوں نے ۱۱/ ستمبر کی عظیم ترین دہشت گردی کر کے امریکہ کی انتظامیہ کو یہ عملی دھمکی دے دی ہے کہ باز آ جاؤ۔ پرسوں مسجد دارالسلام میں اپنے خطابِ جمعہ میں مَیں نے یہی بات کی' اور اسی شام کو میں نے ایریل شیرون کی تقریر ٹی وی پر سنی' جس میں وہ امریکہ کو یہ پیغام دے رہا تھا کہ ہم تمہارے محتاج نہیں ہیں' ہمیں صرف اپنے آپ پر بھروسا ہے۔ تم ہماری قیمت پر عربوں کو خوش کرنے کی کوشش نہ کرو' ہم تمہارے چیتھڑے اڑا دیں گے۔ تم اب بیچ میں آؤ تو سہی۔ یہ پورا تاریخی عمل اب جس critical point پر پہنچ چکا ہے اس کے حوالے سے مجھے صد فیصد یقین ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹاگون پر حملہ اسرائیل ہی کا کام ہے۔ اسرائیل سے کم تر کسی ادارے کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسرائیل کے ایجنٹ امریکہ کے پورے نظام کے اندر اس طرح گھسے ہوئے ہیں جیسے سرطان کا پھوڑا جسم میں اپنی جڑیں جما لیتا ہے۔ پوری انتظامیہ' پوری معیشت' تمام ذرائع ابلاغ' پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا' اُن کے قبضے میں ہیں۔ دفاع کا سارا معاملہ ان کے قبضے میں ہے۔ کوئی اور طاقت یہ کر ہی نہیں سکتی۔ امریکہ کے سکیورٹی معاملات اتنے سادہ

نہیں ہیں بلکہ تہہ در تہہ' دائرہ در دائرہ بہت زیادہ حفاظتی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ کوئی بے شناخت جہاز چند میل کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکتا' لیکن وہاں جہاز پینٹاگون سے آ ٹکرایا۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر پہلا طیارہ ٹکرانے کے پورے ایک گھنٹہ بعد پینٹاگون سے طیارہ ٹکرایا ہے جو اُن کی مملکت کا حساس ترین دفاع کا مرکز ہے۔ اس کا ایک تہائی حصّہ جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ یہ دراصل یہودیوں نے امریکہ کو دھمکی دی ہے۔

امریکہ میں دہشت گردی: یہود کے پیش نظر مقاصد

یہودیوں کے پیش نظر اس دہشت گردی سے مندرجہ ذیل مقاصد ہیں:

(۱) فوری طور پر اس کا رخ اُسامہ اور اس کی تنظیم القاعدہ کی طرف موڑ دینا کہ امریکہ غصے میں لال بھبھوکا ہو کر فوراً اقدام کرے۔ ایک طرف اُسامہ اور اس کے ساتھ طالبان کا ٹنٹا ختم کر دے اور دوسری طرف پاکستان کے عوام جو طالبان کے ہمدرد ہیں' وہ اگر اُٹھیں تو ان کا بھی بیڑہ غرق کر دیا جائے۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار تو اُدھر ہو جائیں گے اور جو مستقبل میں ہمیں خطرہ ہے' اس کا ازالہ بھی ہو جائے گا۔ یہودیوں نے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد پیرس میں فتح کا جشن منایا تھا' جس میں بن گوریان نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: ''ہمیں کسی عرب ملک سے کوئی خطرہ' کوئی اندیشہ نہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے تو صرف پاکستان سے ہے۔'' یہ ہے وہ بات جو مَیں نے کہی تھی کہ اسرائیل کے وجود میں آنے سے پیشتر پاکستان کے قیام میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت نظر آتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ((مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ دَاءً اِلَّا اَنْزَلَ لَہٗ شِفَاءً)) (صحیح البخاری) ''اللہ نے کوئی بیماری ایسی نہیں اُتاری کہ جس کی دوا پیدا نہ کی ہو'' پاکستان دراصل اسرائیل کا توڑ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے پیدا کیا۔ جیسے بچہ کی ولادت بعد میں ہوتی ہے' ماں کی چھاتی میں دودھ پہلے آ جاتا ہے۔ یہ اللہ کی فطرت ہے' اللہ کا طریقہ ہے۔ یہود کو خطرہ ہے تو ہم سے ہے۔ ؎

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

ان کی سوچ یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت تو ٹھیک ہے ہماری جیب میں آ گئی' لیکن عوام کے اندر یہ چنگاری بھڑک سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے بار بار کہا کہ ہم پاکستان پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہتے' یہ ہمارا بہت بڑا اتحادی ہے' ہم اس کی امداد کریں گے' ڈالر بھی دیں گے۔ یہ کہیں

destabilize نہ ہو جائے‘ یہاں کے عوام کہیں کھڑے نہ ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انہیں پاکستانی حکومت کی پوری سپورٹ حاصل ہے لیکن یہ کم سے کم ظاہر نہیں ہونے دیں گے کہ یہ کیا کچھ ہو رہا ہے‘ تاکہ یہاں کے عوام کے اندر جو چنگاری موجود ہے وہ کہیں بھڑک نہ اٹھے۔ اس طرح یہ غیر مستحکم ہو جائے گا۔ ایسا ہونے سے جہاں جنرل پرویز مشرف کی حکومت ختم ہو سکتی ہے وہاں اس کا بھی خطرہ ہے کہ پاکستان ہی نہ ختم ہو جائے۔ اس کا مطلب ہے بھارت کو واک اوور دیا جا سکتا ہے کہ جاؤ اب تم گھس جاؤ اور پولیس ایکشن کرو‘ اس لیے کہ یہاں اب امن نہیں رہا اور ہم امن قائم کرنے آئے ہیں۔ اقوام متحدہ کی فوجیں فی الفور یہاں امن قائم کرنے کے لیے آ جائیں اور ہماری ایٹمی صلاحیت کو ویسے ہی برباد کر دیا جائے۔

ایک چیز تو یہ یہودیوں کے پیش نظر تھی۔ اس میں تو اللہ تعالیٰ نے کچھ تھوڑی سی عافیت پیدا کر دی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ امریکہ غصے میں آگ بگولا ہو کر بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑے گا۔ لیکن وہاں بش کو اپنے باپ کی طرح کولیشن بنانے کی فکر ہو گئی‘ اور کولیشن بنتے بنتے بہرحال وقت لگتا ہے ؎

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے!

کولیشن بناتے بناتے نیٹو بھی دہشت گردی میں اُسامہ اور افغانستان کے ملوث ہونے کے ثبوت مانگنے لگا۔ کسی نے کچھ اور کہا۔ سعودی عرب نے بھی کہا کہ ہمارے اڈوں سے جہاز اڑا کر آپ حملہ نہیں کریں گے‘ وغیرہ وغیرہ۔ اس چکر میں کچھ وقت نکل گیا اور اس دوران امریکہ پر فوراً ہی عیاں ہو گیا کہ یہ تو ہمارے ساتھ کیا ہی اسرائیل نے ہے۔ لیکن وہ یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ چنانچہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے سی این این اور بی بی سی ٹیلی ویژن پر یہ اعلان آیا کہ ۱۱ ستمبر کے حادثے کی جو تحقیقات ہو رہی ہیں اس کی معلومات لیک نہیں ہونی چاہئیں۔ کیوں؟ اُسامہ کے خلاف اگر کوئی ثبوت ہے تو ہزار مرتبہ لیک ہو جائے‘ کسی کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ یہ کون سا leakage ہے جسے روکنا مقصود ہے؟ ’’وہ تو ہمارا متبنّٰی ہے‘ ہمارا بیٹا ہے‘ جو یہ سب کچھ کر رہا ہے‘‘۔ گویا ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

(۲) اس دہشت گردی کے ذریعے یہودیوں نے یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ کو اپنا پیغام دے

دیا۔ شیرون کے الفاظ ہیں: Don't appease the Arabs at our expense یعنی امریکہ ہماری cost پر عربوں کی خوشامد اور ان کو خوش کرنے کی پالیسی ترک کر دے۔ شیرون نے امریکہ سے کہا ہے کہ جیسے تم نے چیکوسلواکیہ پر جرمنی کا قبضہ تسلیم کر کے اسے ہٹلر کے حوالے کر دیا تھا تو کیا تم چاہتے ہو کہ ہم بھی چیکوسلواکیہ بن جائیں؟ ہم نہیں بنیں گے۔

افغانستان میں کیا ہوگا؟

’’کھسیانی بلّی کھمبا نوچے‘‘ کے مصداق یہ افغانستان پر حملہ تو ضرور کریں گے۔ اس کے لیے امریکہ اور اُس کے اتحادیوں نے زبردست تیاریاں کی ہیں۔ لہٰذا کچھ نہ کچھ کام تو یہ کر کے دکھائیں گے۔ البتہ مجھے اُمید ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ﴾ (المائدۃ: ۶۴) اس آگ کی بھڑک ان شاء اللہ کم ہو جائے گی۔ افغانستان میں کیا ہوگا‘ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ جیسے قرآن مجید میں حضور ﷺ سے کہلوایا گیا: ﴿وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾﴾ (الانبیاء) ’’میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا دور ہے۔‘‘ ﴿وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾﴾ (الانبیاء) ’’اور مَیں نہیں جانتا‘ شاید کہ (اس تاخیر میں) تمہارے لیے کوئی آزمائش ہو اور کچھ مدّت تک تمہیں فائدہ (اٹھانے کی مہلت) دینا مقصود ہو‘‘۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں کچھ وقت کے لیے مہلت دے اور تمہاری رسّی دراز کر دے اور ابھی عذاب کو ٹال دے۔ بہرحال یہ کون دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوگا! تباہی بھی آ سکتی ہے‘ کوئی بڑا setback بھی آ سکتا ہے۔ نشیب و فراز تو ہوتے ہیں۔ احیائے اسلام کا عمل تو جاری ہے‘ لیکن احیائی عمل کے ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں بدر کے موقع پر گراف آسمان پر چلا گیا تھا اور غزوۂ اُحد میں وہ بہت نیچے بھی آ گیا تھا جس کے بعد مسلمانوں کے حوصلے پست بھی تو ہو گئے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے تشفّی دی تھی: ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ﴾ (آلِ عمران) ’’گھبراؤ نہیں‘ ڈرو نہیں‘ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو‘ اگر تمہیں کوئی چرکا لگا ہے تو تمہارے دشمنوں کو بھی اسی طرح کا چرکا لگ چکا ہے۔‘‘ انہوں نے تو ہمت نہیں چھوڑی‘ ایک سال بعد تم پر دوبارہ حملہ آور ہو گئے۔ لہٰذا کوئی setback بھی آ سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے‘ اور اللہ

کرے کہ یہ ہو جائے‘ کہ اب بھی کوئی واقعۂ فیل ظہور پذیر ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ چڑیوں کے ذریعے سے‘ ان کی چونچوں اور پنجوں میں پکڑی ہوئی کنکریوں کے ذریعے سے ہاتھی والوں کو برباد کر سکتا ہے: ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝۵﴾ (الفیل) اللہ تعالیٰ نے پورے لشکر کو ایسے کر دیا تھا جیسے کھایا ہوا بھوسا جب جگالی کے بعد نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ کر سکتا ہے‘ اس کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ اسے ہر شے کی قدرت حاصل ہے۔

دوسری صلیبی جنگ کا آغاز

درحقیقت اصل مسئلہ فلسطین کا ہے جو اَب شروع ہونے والا ہے۔ جنگ کی اصل بھٹی وہاں دہکے گی۔ اگر فلسطینیوں کے خلاف کوئی بہت بڑا اقدام ہو جاتا ہے اور واقعتاً گنبد صخرہ اور مسجد اقصیٰ گرا دیے جاتے ہیں تو عالمِ عرب میں جو طوفان اٹھے گا وہ روکے نہ رکے گا۔ حسنی مبارک ہوں‘ شاہ فہد ہوں یا کوئی اور‘ یہ اس طوفان کو نہیں روک سکتے۔ مسلمانوں میں بہرحال غیرت اور حمیت موجود ہے۔ مسلمان خواہ بالکل اَن پڑھ اور بے عمل ہو وہ بھی مسجد کی حرمت پر کٹ مرنے کو تیار ہو جاتا ہے ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا!

وہ چاہے کان پور کی مسجد تھی یا شہید گنج کی مسجد تھی‘ لوگوں نے جانیں دی ہیں چاہے نماز نہ پڑھتے ہوں۔ تو اس حمیت و غیرت سے جو طوفان اُٹھے گا یہ ہوگا وہ الملحمۃ العُظمٰی۔ اس کی طرف اب پیش رفت ہو رہی ہے۔ (پرسوں ۵/اکتوبر کے جمعے میں مَیں اس موضوع پر خطاب کر چکا ہوں اور ’’کتابُ الملاحم‘‘ کی احادیث کے حوالے سے گفتگو کر چکا ہوں۔ اُس خطاب کی حیثیت دراصل آج کے خطاب کے ضمیمے کی ہے اور وہ اس سے بہت متعلق ہے۔)

جن عظیم جنگوں کی حضور ﷺ نے پیشین گوئی کی ہے ان کا آغاز خلیج کی جنگ سے ہو چکا۔ صدام حسین نے اسے ’’اُمّ المَحارب‘‘ (Mother of Wars) کہا تھا۔ اس کا نقشہ بھی احادیث میں موجود ہے۔ لیکن اب جو جنگ ہونے والی ہے وہ الْمَلْحمۃُ الْعُظْمٰی ہوگی۔ لحم گوشت کو کہتے ہیں اور قصائی کی دکان کو عربی میں ’’مَلحَم‘‘ کہتے ہیں جہاں گوشت کے ٹکڑے کیے جاتے ہیں۔ یہی لفظ فتح مکہ کے موقع پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے استعمال کیا تھا۔ ان کے دل میں تھا کہ اب ہم قریش سے انتقام لیں گے۔ چنانچہ وہ علَم اٹھائے ایک خاص

کیفیت میں کہتے جا رہے تھے: ’’اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَۃِ‘ اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَۃِ‘‘ یعنی آج ہے گوشت کے ٹکڑے اڑانے کا دن۔ حضور ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو آپؐ نے ان سے کہا کہ نہیں‘ اس کے بجائے یہ کہو کہ ’’اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَرْحَمَۃِ‘‘ آج کا دن تو رحمت کا دن ہے۔ آج تو مَیں ان سب کو معاف کر دوں گا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد آپؐ نے قریش سے مخاطب ہو کر فرمایا: ’’آج میں تم سے وہی بات کہوں گا جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: ((لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ‘ اذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاء)) ’’آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں‘ جاؤ تم سب آزاد ہو۔‘‘ احادیث میں ’’اَلْمَلْحَمَۃُ الْکُبْرٰی‘‘ کا لفظ بھی آیا ہے اور ’’المَلحَمۃ العُظمٰی‘‘ بھی۔ عُظمٰی مونث ہے ’’اعظم‘‘ کا‘ جس کا مفہوم ہے ’’سب سے بڑا‘‘۔ المَلحَمۃ العُظمٰی سے مراد ہے ’’سب سے بڑی لڑائی‘‘۔ میرے نزدیک یہ war کے معنی میں نہیں بلکہ battle کے معنی میں ہے۔ انگریزی میں یہ دونوں لفظ علیحدہ ہیں۔ war سالوں پر محیط ہوتی ہے جبکہ battle ایک خاص جگہ پر ہونے والی لڑائی کو کہتے ہیں۔ حضور ﷺ اور قریش کے درمیان چھ سالہ جنگ (war) تھی‘ لیکن اس دوران جو جنگیں ہوئیں‘ مثلاً جنگ بدر اور جنگ اُحد‘ یہ battles تھیں۔ یہ عظیم ترین جنگ شاید اس اعتبار سے نہ ہو جیسے جنگ عظیم اوّل اور جنگ عظیم دوم اپنی وسعت اور طوالت کے اعتبار سے تھیں‘ البتہ جنگ کی شدت اور ہولناکی کے اعتبار سے یہ عظیم ترین جنگ ہوگی۔

مَیں نے خطاب کے شروع میں کہا تھا کہ ع سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ حجاز و حولِ قدس! ’’عہد نامہ جدید‘‘ کی آخری کتاب ’’مکاشفاتِ یوحنّا‘‘ میں اس جنگ کو ’’ہرمجدون‘‘ (Armageddon) کہا گیا ہے۔ ہرمجدون عبرانی لفظ ہے۔ ’’ہر‘‘ اونچی جگہ یا سطح مرتفع کو کہتے ہیں اور ’’مجدون‘‘ وادی کو۔ ’’وادی مرتفع‘‘ دراصل اسرائیل‘ شام اور لبنان کے درمیان جو مثلث بنتی ہے وہاں پر واقع ہے۔ یہاں پر یہ بڑی جنگ لڑی جائے گی اور یہ بھی جنگ صلیب (Cusade) ہوگی‘ جیسا کہ بش نے کہا ہے۔ سیکنڈ ملینیم شروع ہوا تھا تو پہلی صلیبی جنگ شروع ہوئی تھی‘ تھرڈ ملینیم شروع ہوا ہے تو یہ دوسری صلیبی جنگ ہوگی۔

اس دفعہ مَیں امریکہ گیا تو پہلی دفعہ مجھے وہاں ’’The Philadelphia Trumpet‘‘ نامی رسالہ ملا۔ امریکہ کے جو انتہا پسند پروٹسٹنٹ ہیں یہ ان کا رسالہ ہے۔ ان کے بارے میں اب

کہا جا رہا ہے کہ وہ ''عیسائی صہیونی'' (Christian Zionists) ہیں۔ یہ لوگ ہیں تو عیسائی' پروٹسٹنٹ ہیں' لیکن اسرائیل کے یہودیوں سے بڑھ کر حمایتی ہیں۔ چار سال پہلے تنظیم اسلامی کا ایک کنونشن ہوسٹن میں ہوا تھا جو امریکہ کے جنوبی علاقے کا ایک شہر ہے۔ اس میں ایک سیشن ''Interfaith Dialogue'' کا رکھا گیا تھا۔ ہم نے ایک عیسائی سکالر کو بھی بلایا تھا اور ایک یہودی عالم ڈاکٹر وشوگراڈ کو بھی جو یونیورسٹی آف امریکہ میں پروفیسر امریطس ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اسرائیل کی پشت پناہی تو عیسائی کر رہے ہیں' ہم تو نہیں۔ زیادہ تر عملی یہودی اسرائیل کے قیام کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے تو ۱۹۶۷ء کے بعد اسرائیل کو تسلیم کیا ہے۔ وہ تو منتظر تھے کہ ہمارا مسیحا آئے گا تو ہم اس کی قیادت میں جنگ کریں گے' جیسے شیعہ منتظر تھے کہ مہدیٔ موعود آئیں گے اور پھر وہ کچھ کریں گے۔ وہ تو امام خمینی نے کہا کہ مہدی تو جب آئیں گے تب آئیں گے' لیکن ہم ان کے لیے کچھ راستہ تو صاف کریں۔ Zionists نے آگے بڑھ کر اسرائیلی ریاست قائم کر لی' اور جب یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا تب مذہبی یہودیوں نے اسے اپنی ریاست سمجھا ہے۔ اسرائیل میں جو نئے settlements بنے ہیں ان میں اکثر و بیشتر مذہبی یہودی آگے آئے ہیں۔ ووکلین کے علاقے سے سب سے زیادہ آئے ہیں جو نیویارک کا جنوبی علاقہ ہے اور یہودیوں کا بہت بڑا گڑھ ہے۔ نیویارک کو اسی لیے ''جیویارک'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے وہاں پر جو کرسچین زائنسٹ کہلاتے ہیں وہ یہودیوں سے بھی کہیں بڑھ کر اسرائیل کے سپورٹر ہیں۔

Trumpet نامی رسالے میں ایک مضمون ہے: ''The Last Crusade'' یعنی اب آخری صلیبی جنگ ہونے والی ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ وہ کس قدر کھل کر باتیں کر رہے ہیں۔ رومن کیتھولکس کو وہ شیطان کہتے ہیں۔ پوپ کو بھی وہ شیطان کہتے ہیں۔ امریکہ نے اس وقت یورپ کو عیسائیت کی بنیاد پر جمع کیا ہے اور اس میں زیادہ تر کیتھولکس ہیں۔ برطانیہ ان کے ساتھ بڑی مشکل سے شامل ہوا' اس لیے کہ وہ پروٹسٹنٹس کا سردار ہے۔ اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ یورپ اب دوبارہ رومن امپائر کھڑی کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کیتھولک عیسائی فلسطین کو یہودیوں سے بھی چھیننا چاہتے ہیں اور مسلمانوں سے بھی' تاکہ وہاں کیتھولکس کی حکومت قائم ہو جائے' جیسے مشرقی تیمور میں قائم کر دی گئی۔ عیسائیوں کے سارے مقاماتِ مقدسہ فلسطین ہی میں ہیں۔ حضرت مسیحؑ بیت اللحم میں پیدا ہوئے جو وہیں ہے۔ اسی فلسطین میں (ان کے خیال میں) وہ

سولی دیے گئے' یہیں ان کا بعث بعد الموت ہوا۔ ان کے بڑے بڑے چرچ بھی وہیں پر ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ آخری صلیبی جنگ کی تیاری ہو رہی ہے۔ چنانچہ KFOR (Kosovo Force) جو نیٹو کی پوری طاقت ہے' پہلے جرمنی سے بوسنیا لائی گئی۔ وہاں انہوں نے خود جنگ کروائی اور مسلمانوں کی نسل کشی ہوئی۔ پھر خود مصالحت کے لیے آ گئے۔ پھر کوسووو میں انہوں نے خود آگ بھڑکائی اور مسلمانوں کا قتل عام کروایا اور پھر خود ہی وہاں امن فوج کی حیثیت سے آ گئے۔ اب وہ مقدونیہ میں داخل ہو گئے ہیں اور ان کا اگلا قدم قبرص (Cyprus) ہوگا جہاں یہ ترکوں اور یونانیوں کو لڑائیں گے اور وہاں آ جائیں گے۔ وہاں سے ایک چھلانگ لگا کر فلسطین پہنچیں گے۔ اس طرح یہ رومن امپائر کی طرح کی ایک رومن کیتھولک ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔

امریکہ کے عیسائیوں میں بھی کوئی ایک طبقہ نہیں ہے۔ کیتھولکس بھی ہیں' جو یہودیوں کے زیادہ ہمدرد نہیں تھے' لیکن اب تابع ہو چکے ہیں۔ اسحاق رابن نے جب امن مذاکرات کا آغاز کیا تھا تو واشنگٹن سے واپس اسرائیل آتے ہوئے پہلے وہ روم میں رکا تھا۔ اس نے پوپ کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا ایک مرتبان پیش کرتے ہوئے کہا تھا: تین ہزار برس تک ہم نے اس کی حفاظت کی ہے' اب یہ مَیں آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اس کے بعد پوپ بالکل رام ہو گیا اور یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین پورا پورا معاہدہ ہو گیا۔ اب پوری عیسائی دنیا بحیثیت مجموعی یہودیوں کے شکنجے میں ہے۔ البتہ ان کے اندر بھی اختلافات ہیں۔ کیتھولکس میں جو انتہا پسند وائٹ کرسچین ملیشیاز ہیں ان کے نزدیک دشمن نمبر ایک یہودی' دشمن نمبر دو مسلمان اور دشمن نمبر تین سیاہ فام ایفرو امریکن ہیں' خواہ وہ عیسائی ہو چکے ہوں۔ ان کے یہ تین دشمن ہیں جن سے انہوں نے اپنے خیال کے مطابق امریکہ کی سوسائٹی کو صاف کرنا ہے۔ لیکن پروٹسٹنٹس کے اندر انتہا پسند وہ ہیں جنہیں کہا جا رہا ہے کہ یہ ''کرسچین زائنسٹ'' ہیں۔ یہ اسرائیل کے خود اسرائیل سے بڑھ کر حمایتی ہیں۔

عظیم ترین جنگ کا آخری نتیجہ

اب جو جنگ ہو گی اس کا نتیجہ کیا نکلے گا' یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے: ﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ﴾ (آلِ عمران: ۱۴۰) ''یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم

لوگوں کے مابین گردش دیتے رہتے ہیں۔'' اس کا آخری نتیجہ یعنی ڈراپ سین بہرصورت یہ ہوگا کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہوگا اور پوری دنیا پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی حکومت قائم ہوگی۔ وہ گویا قیامت کی تمہید ہوگی' اس کے بعد بس قیامت آ جائے گی۔ چنانچہ تخلیق کائنات کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا نقطۂ عروج محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ دین کی تکمیل بھی محمد ﷺ پر ہوئی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جو خلافتِ ارضی دی گئی تھی' جب وہ خلافت پوری دنیا میں قائم ہو جائے گی تو اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہ گویا خاتمہ کا آغاز ہوگا۔ اس کے بعد قیامت ہے۔ آخری نتیجہ تو یہ نکلنا ہے۔ اُس سے پہلے سزائیں ہمیں بھی مل رہی ہیں۔

ایک کانٹے کی بات جو میں اُس وقت چھوڑ گیا تھا' بیان کر دوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس مغضوب علیہم قوم کو' اس ملعون قوم یہود کو اب تک چھوٹ دے رکھی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ بڑے عذاب کے مستحق ہو چکے تھے لیکن انہیں ملیامیٹ نہیں کیا گیا' بلکہ ابھی تک چھوٹ دے رکھی ہے' بلکہ ایک مرتبہ ابھارا ہے۔ قریباً انیس سو برس کے بعد یہ گزشتہ صدی میں ابھرے ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں بالفور ڈیکلریشن منظور ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام عمل میں آیا' ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کی توسیع ہوئی اور یروشلم پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ یہ سارا کچھ کیوں ہوا ہے؟ درحقیقت اللہ تعالیٰ اس ''خیرِ اُمّت'' اُمّتِ محمد ﷺ کے بہترین حصّے کو ان ملعونوں کے ہاتھوں سزا دے رہا ہے' اس لیے کہ جو جرم یہودیوں نے کیا تھا وہی ہم نے بھی کیا۔ انہوں نے اللہ کی کتاب کو پیٹھ کے پیچھے پھینکا ﴿نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ (البقرۃ:۱۰۱) ہم نے بھی اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینکا یا نہیں؟ تمام اسلامی ممالک نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہوئے' لیکن کہیں اسلامی قانون نافذ کیا؟ کہیں اسلامی نظام قائم کیا؟ تو جو جرم ان کا تھا وہی ہمارا ہے۔ ہم ''خیرِ اُمّت'' ہیں اور اس اُمّت کا بہترین حصّہ عرب ہیں۔ ان پر اللہ کا خصوصی فضل یہ ہوا کہ ان کی مادری زبان میں اللہ کی کتاب موجود ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اللہ کے دین کو پیٹھ دکھائی۔ نوآبادیاتی نظام سے جو ملک بھی آزاد ہوا' اس نے اپنا قبلہ ماسکو کی طرف کر لیا یا واشنگٹن کی طرف۔ کسی نے مکّہ کو قبلہ نہیں بنایا۔ چنانچہ یہ بدترین سزا ہے۔ حدیث نبویؐ ہے: ((وَيْلٌ لِّلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ)) (صحیح البخاری) ''عربوں کے لیے بربادی ہے اُس شر سے جو قریب آ پہنچا ہے۔'' ترمذی شریف میں تو یہاں تک روایت ہے: ((مِنَ اقْتِرَابِ

السَّاعَةِ هَلَاكُ الْعَرَبِ)) (الجامع الصغیر) ''قیامت کے قرب کی ایک نشانی یہ ہے کہ عرب ہلاک ہو جائیں گے۔'' ایک حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے قریب فلاں فلاں فتنے ظہور پذیر ہوں گے اور ایسی بربادی آئے گی تو کسی زوجہ محترمہؓ نے پوچھا: عرب اُس دن کہاں ہوں گے؟ فرمایا: ((اَلْعَرَبُ يَوْمَئِذٍ قَلِيْلٌ)) ''عرب اُس دن بہت کم ہوں گے۔'' یہود کا آخری خاتمہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھوں ہوگا۔ وہ عذاب جو دو ہزار برس تک اُن سے ٹلا رہا' وہ آئے گا اور ان کے رسول ہی کے ہاتھوں آئے گا' لیکن اس سے پہلے مسلمانوں پر یہ عذاب آنا ہے جو Holocaust کے درجے کا عذاب ہوگا۔ المَلحَمۃ الکبریٰ (سب سے بڑی جنگ) اور المَلحَمۃ العُظمیٰ (عظیم ترین جنگ) آنے والی ہے اور یہ بہت جلد وقوع پذیر ہوگی۔

ہمارے کرنے کے کام

اب آخری بات یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے! کچھ کریں بھی یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟

(۱) انفرادی توبہ: اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ لہٰذا ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ دنیا میں تباہی و بربادی آ بھی جائے' آخرت بچ جائے۔ چنانچہ پہلا کام یہ ہے کہ ہر شخص ایسی توبہ کرے' جس کے لیے قرآن حکیم میں ''تَوْبَةً نَّصُوْحًا'' کے الفاظ آئے ہیں۔ توبہ کی تسبیح نہیں' آیت کریمہ کا ختم نہیں۔ توبہ یہ ہے کہ اپنی معاش کے اندر جھانکئے' اپنی معاشرت کے اندر جھانکئے۔ جہاں جہاں اسلام کے خلاف کچھ نظر آئے' اسے کاٹ کر پھینک دیجیے۔ بے پردگی ہے تو اسے ختم کر دیجیے۔ کمائی میں حرام کا عنصر ہے تو اسے نکال پھینکئے۔ توبہ کیجیے' ابھی کیجیے! عملی طور پر دینی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہو رہی ہے تو ابھی سے کمر ہمت کس لیجیے! اللہ کے دین کے غلبے کی جدّوجُہد کے لیے ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶۲﴾ (الانعام) کہتے ہوئے آگے بڑھیے۔ اگر میرے اور آپ کے کیے کچھ نہ ہوا تب بھی کم سے کم میری اور آپ کی آخرت تو بچ جائے گی۔ ہم دائمی اُخروی عذاب سے تو بچ جائیں گے۔

(۲) اجتماعی توبہ: یہ توبہ کیسے ہوگی؟ یہ سلطنت خداداد جو اللہ نے ہمیں عطا کی تھی' اس میں اسلام کا نظام قائم اور شریعت نافذ کی جائے۔ اس کی خاطر جدّوجُہد کے لیے ایک منظم جماعت بنا کر تن من دھن کے ساتھ لگ جائیں۔ اول تو تمام جماعتیں ایک متحدہ محاذ بنائیں اور میدان کے اندر

آ جائیں۔صرف طالبان کی حمایت کے لیے نہیں‘ اس ملک میں اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے یکجا ہو جائیں۔کاش یہ ساری کی ساری دینی جماعتیں پاور پالیٹکس سے پسپائی اختیار کریں اور ایک مطالباتی تحریک‘ ایک مزاحمتی تحریک‘ ایک پریشر موومنٹ اٹھائیں۔ایک پریشر گروپ کی صورت میں مطالبہ کریں کہ یہاں شریعت نافذ کرو‘ اللہ کے دین کو قائم کرو۔اس کے لیے سب دینی جماعتیں میدان میں آ جائیں۔

گزشتہ دِنوں میرا ایک مضمون چھپا تھا کہ امریکہ میں دہشت گردی سے پیدا شدہ خوف ناک عالمی صورت حال کے نتیجے میں جو کچھ افغانستان میں ہونے والا ہے‘ اس بہت بڑے شر میں سے پاکستانی معاشرے کے لیے ایک خیر پیدا ہوا ہے۔وہ یہ کہ ملک میں ایک جانب سیکولر اور مغرب زدہ عناصر اور دوسری جانب دین و مذہب کے ساتھ عملی و جذباتی وابستگی رکھنے والے لوگوں کے مابین واضح امتیاز اور جداگانہ تشخص کا احساس و ادراک نمایاں طور پر پیدا ہو گیا ہے۔گویا پاکستانی معاشرے میں ایک نئی دو قطبی تقسیم (Polarisation) پیدا ہو رہی ہے جو یہاں اسلامی انقلاب کے اعتبار سے نہایت مفید ہے۔اس سے آگے ایک خیر مزید ظاہر ہو رہا تھا کہ مذہبی جماعتیں خود بخود ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہی تھیں۔لیکن بدقسمتی سے اب پھر پسپائی ہے۔دفاعِ پاکستان و افغانستان کونسل کے تحت چند ایک جلسے ہوئے‘ اس کے بعد اب جماعتیں سولو فلائٹ کر رہی ہیں۔اگر یہ سب کے سب یکجا ہو کر کرتے تو ساری طاقت یکجا ہوتی اور اس کا بہت اثر ہوتا۔ کیا کیا جائے‘ شاید ہماری سابقہ کوتاہیوں کی نحوست ابھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ رہی‘ ورنہ یہ وقت ایسا تھا کہ ایک مضبوط اتحاد وجود میں آ سکتا تھا۔میں نے دفاعِ افغانستان کونسل میں شرکت پر قاضی حسین احمد صاحب کو مبارک باد دی تھی۔جب افغانستان پر عالمی پابندیاں لگائی گئیں تو ۱۰ جنوری کو پشاور میں مولانا سمیع الحق صاحب کی دعوت پر دینی و مذہبی جماعتوں کے قائدین جمع ہوئے اور دفاعِ افغانستان کونسل بنی تو اس میں قاضی صاحب بھی پہنچے اور اس کے بعد انہوں نے اس میں مسلسل حصّہ لیا۔اس کونسل میں ہم بھی شریک ہیں۔ہماری جماعت چھوٹی ہے‘ ہم خادموں کی حیثیت ہی سے شامل ہو جائیں گے۔لیکن افسوس کہ محسوس ہو رہا ہے کہ اتحاد کی کیفیت باقی نہیں رہی۔اللہ کرے کہ دینی جماعتیں ایک مٹھی بن جائیں۔اس کے لیے دعا کے ساتھ بھرپور کوشش بھی ہونی چاہیے۔میری چھوٹی سی ایک تنظیم ہے‘ مَیں اس سطح پر کوشش کر رہا ہوں۔

(۳) پاکستان کی ایک منزل ہے‘ ایک تقدیر مبرم ہے۔جیسے علّامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں کہا تھا کہ ’’ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قائم ہونا destiny (تقدیرِ مبرم) ہے‘‘ اسی طرح میں کہہ رہا ہوں کہ پاکستان کی destiny ہے کہ کفر اور اسلام کے مابین جو آخری معرکہ ہونا ہے اس میں پاکستان کو بڑا crucial کردار ادا کرنا ہے۔اقبال نے کہا تھا ؎

دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا!

اقبال نے یہاں لفظ ’’تہذیب‘‘ استعمال کیا ہے۔آج سارا یورپ تہذیب کی دہائی دے رہا ہے‘ بش بھی اور بلیئر بھی تہذیب تہذیب پکار رہے ہیں:

Our civilization has been threatened

کیا ہم جنسیت (homo sexuality) تمہاری تہذیب ہے؟ تمہاری تہذیب یہ ہے کہ بل کلنٹن نے پچھلے سال نیو ایئر ڈے پر اپنے پیغام میں کہا تھا کہ عنقریب امریکی قوم کی اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہو گی۔یہ تہذیب ہے تمہاری؟ one parent family رہ گئی ہے‘ بیڑہ غرق ہو چکا ہے تمہارا۔یہ تو ٹیکنالوجی ہے جو تمہیں لے کر کھڑی ہے۔تمہاری تہذیب کے بارے میں اقبال نے کہا تھا ع

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی!

اور وہ کر چکی ہے۔تہذیب تو مر چکی ہے۔فیملی سسٹم برباد ہو چکا ہے۔اس ٹیکنالوجی کے لیے اقبال نے لفظ ’’مشین‘‘ استعمال کیا ہے ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا!
اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اس معرکۂ روح و بدن میں پاکستان نے اہم کردار ادا کرنا ہے۔اسرائیل کی پیدائش سے نو مہینے پہلے اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو قائم کیا اور یہ لیلۃ القدر میں نازل ہوا ہے۔جس طرح قرآن حکیم لیلۃ القدر میں نازل ہوا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝﴾ (القدر) اسی طرح پاکستان نازل

ہوا ہے۔ ہمیں جو ایٹمی صلاحیت حاصل ہے اس کا ہر قیمت پر تحفظ کرنا ہے۔ مَیں حالیہ بحران کے ضمن میں حکومت پاکستان کے موقف پر اپنے جذبات کا اظہار کر چکا ہوں۔ یہاں اتنا اضافہ کر رہا ہوں کہ خدا کے لیے مشرف صاحب سوچئے! کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ اگلی دھمکی آئے کہ اگر تم اپنی ایٹمی صلاحیت ختم نہیں کرتے تو تم ہمارے دشمن ہو! اور آپ کانپ کر رہ جائیں کہ اب کیا کریں! اس وقت بھی تو یہی بات آئی ہے نا کہ کوئی درمیانی شکل نہیں' یا ہمارا ساتھ دو یا ہمارے دشمن شمار ہو۔ اور آپ کانپ گئے کہ جی جی ہم حاضر ہیں۔ آپ نے قومی غیرت وحمیت کا جنازہ نکال دیا۔ عدل وانصاف کے مسلّمہ تقاضے پامال کر دیے کہ جرم کا ثبوت تو کہیں ہے نہیں۔ آج بھی برطانیہ کہہ رہا ہے کہ convincing ثبوت نہیں ہے' اس کی بنیاد پر کوئی مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا۔ پرویز مشرف صاحب کو پتا نہیں انہوں نے کیا دکھایا ہے کہ وہ واقعتاً اسے قابلِ اطمینان مان گئے ہیں۔ طالبان خود کہہ رہے تھے کہ اُسامہ کے خلاف ثبوت پیش کرو' نہ صرف ہم یہاں خود مقدمہ چلائیں گے بلکہ اسے حوالے بھی کر دیں گے' لیکن ثبوت تو لاؤ ہمارے سامنے! یہ تو اسرائیل کی سازش ہے جواب امریکہ پر عیاں ہے۔

آخری جنگ الملحمۃُ العُظمیٰ مشرق وسطیٰ ہی میں ہوگی اور بڑی عظیم جنگ ہونی ہے۔ لیکن اس میں پاکستان کو جو کردار ادا کرنا ہے اس کا اشارہ حدیثِ نبویؐ سے مل جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک مشرقی ملک سے فوجیں جائیں گی جو حضرت مہدی کی حکومت عرب میں قائم کریں گی اور خراسان سے سیاہ عَلَم لے کر فوجیں نکلیں گی جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ کھڑی ہوں گی اور یروشلم واپس لیں گی۔ یروشلم پہلے عربوں نے ۱۰۹۹ء میں کھویا اور ۸۸ برس بعد ۱۱۸۷ء میں کُردوں نے واپس لیا۔ صلاح الدین ایوبی ایک کرد تھے۔ اب ۱۹۶۷ء میں پھر عربوں نے کھویا' لیکن اب بھی عرب اسے واپس نہیں لے سکیں گے' بلکہ خراسان سے چلنے والے پرچم بردار لشکر اسے واپس لیں گے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں جو بہت بڑا خراسان تھا اس کا دل افغانستان ہے۔ پاکستان کا مالاکنڈ ڈویژن اس خراسان کا حصّہ ہے۔ ایران کا ایک علاقہ بھی اس کا حصّہ ہے اور خراسان کے نام سے ایران کے شمال مشرقی کونے پر اس کا ایک صوبہ ہے۔ آزاد ترک ریاستیں بھی اس کا حصّہ ہیں۔ یہ ایک ملک تھا ''خراسانِ عظیم''۔ ایرانی اس کو ''خراسانِ بزرگ'' کہتے ہیں۔ اس بارے میں اُسامہ نے کہا تھا کہ میں تو خراسان کے اندر آ کر بیٹھ گیا ہوں'

اللہ نے مجھے خراسان میں پہنچا دیا ہے۔ انہوں نے یہ بات اسی حدیث کے حوالے سے کہی تھی۔ بہرحال اس ایٹمی صلاحیت کی حفاظت ہمیں اپنی جان سے بھی بڑھ کر کرنی ہے۔ پاکستان داؤ پر لگ جاتا ہے تو لگ جائے' بچانے والا اللہ ہے' لیکن جو ہماری ایٹمی صلاحیت ہے یہ ہمارے پاس پوری اُمّتِ مُسلمہ کی امانت ہے۔ اس کو ہم کوئی گزند نہیں پہنچنے دیں گے۔

(۴) اس آزمائش کے وقت ہم اپنے افغان بھائیوں کی جو مدد بھی کر سکتے ہیں' کریں۔ پاکستان کی حکومت کے موقف کے خلاف اپنا اظہارِ رائے ڈٹ کر کریں۔ انہوں نے سرکاری سطح پر ریلیاں نکال دی ہیں' آپ عوامی سطح پر میدان میں آئیں۔ اظہار تو کریں' بولیں تو سہی' گونگے تو بن کر نہ بیٹھیں۔ اگر ایسا کریں گے تو حکومت کے ان کاموں کے اندر آپ کی شمولیت سمجھی جائے گی۔ آیئے تاکہ اپنا اختلاف ظاہر کریں' بآوازِ بلند کریں۔ اس میں جو تکلیف آتی ہے آئے' ہرچہ بادا باد۔ اس کے علاوہ دامے' درمے' سخنے جو مدد بھی پہنچائی جاسکتی ہے' پہنچائی جائے۔ امریکہ اور اُس کے حواری افغانستان کے لیے امداد کے نام پر جو کچھ بھیج رہے ہیں یہ تو وہاں کے افغانوں کو طالبان کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے ہے کہ دیکھو ہم تمہارے خلاف نہیں لڑنے آئے' تمہیں تو ہم کھلا پلا رہے ہیں' اصل پِس کی گانٹھ یہ طالبان ہیں جن کی وجہ سے تم پر مصیبت آئی ہے' ان کے خلاف کھڑے ہو جاؤ! یہ سارے ہتھکنڈے یورپی اقوام کے ہیں۔ افغانوں کو حقیقتاً امداد پہنچانے کے جو ذرائع ہیں انہیں اختیار کرنے میں کوئی کمی نہ کی جائے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات○○

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل
خلافت کی حقیقت
اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام
ڈاکٹر اسرار احمد
اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 120 روپے

الحاد و تشکیک
انسان کی فکری اور عملی گمراہیاں

راحیل گوہر

انسان دو پہلوؤں کے تحت زندگی گزارتا ہے‘ ایک ہے ’’عدمِ علم‘‘ اور دوسرا ’’علم عدمِ وجود‘‘۔ عدمِ علم کا خلاصہ کریں تو یہ چیز سامنے آتی ہے کہ دنیا کی دیگر بے شمار چیزوں کی طرح ہمیں خدا کا بھی علم نہیں۔ ہمارے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کہ جس کی بنا پر ہم خدا کے ہونے کا یقین کر سکیں۔ تاہم ہمارے علم میں ایسی بھی کوئی دلیل نہیں ہے کہ جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ خدا نہیں ہے۔ گویا ہم خدا کے اقرار کرنے کی پوزیشن میں ہیں اور نہ انکار کرنے کی! یہ تذبذب ہی انسان کے احساس میں ریب و تشکیک کو جنم دیتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان یقینی اور غیر یقینی کی کیفیت میں الجھا رہتا ہے۔ یہ کیفیت نفاق کی ہی ایک شکل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿مُّذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ ؕ﴾ (النساء: ۱۴۳)

’’یہ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں‘ نہ پورے ان (مسلمانوں) کی طرف ہیں اور نہ اُن (کافروں) کی طرف۔‘‘

انسان کی دوسری کیفیت ’’علم عدمِ وجود‘‘ کی ہے۔ یعنی (یہ غلط سوچ کہ) ہم قطعیت کے ساتھ جانتے ہیں کہ خدا نہیں ہے۔ ہم پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ کائنات خود بخود بن گئی ہے اور آپ سے آپ چل رہی ہے‘ اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہستی نہیں ہے۔ ہمیں عقلاً اس پر تصدیق بالقلب والی کیفیت حاصل ہے۔ اسی لیے ہم خدا کا انکار کرتے ہیں۔ انسان کی اسی غلط سوچ کی عکاسی قرآن حکیم میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

﴿وَقَالُوۡا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا نَمُوۡتُ وَنَحۡيَا وَمَا يُهۡلِكُنَاۤ اِلَّا

Email:raheelgoher5@gmail.com

الدَّهۡرُ ۚ﴾ (الجاثیۃ: ۲۴)

’’اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: جو کچھ زندگی ہے بس یہی ہماری دنیوی زندگی ہے‘ (اسی میں) ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں کوئی اور نہیں زمانہ ہی ہلاک کر دیتا ہے۔‘‘

اس آیۂ مبارکہ کی تشریح میں مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ ’’تفسیر ماجدی‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’خصوصاً وسطی اور جنوبی عرب میں کثرت سے اس عقیدے اور مشرب کے لوگ تھے کہ نہ کوئی حیاتِ اُخروی ہے نہ کوئی جزا و سزا۔ جو کچھ ہو رہا ہے سب قوانینِ مادّی و طبیعی کے لحاظ سے ہو رہا ہے۔ انہی کی ماتحتی میں انسانیت کو موت آ جاتی ہے اور انہی کے مطابق انسان پیدا بھی ہوتا ہے۔ ان کے بڑے بڑے شاعر یہی مضمون باندھ گئے ہیں۔ گویا جاہلیت کے ’’روشن خیال‘‘ کا ٹھیک وہی مسلک ہے جو آج کے مہذب ’’روشن خیال‘‘ فرنگی کا ہے۔ گویا مادّیت (meterialism) کا مسلک دنیا کا جدید ترین نہیں بلکہ بہت قدیم مذہب ہے۔‘‘

مادّیت مادّے (matter) کو قدیم جاننے کی بنیاد پر استوار ہے اور اس میں یونانی سب سے آگے تھے۔ یونانی روایت میں دہریت (Atheism) کو ایک فلسفیانہ سیاق و سباق فراہم کیا گیا جو بعد میں الحاد اور دیگر روایتوں کی بھی رہنمائی اور پشت پناہی کرتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دور ایسا بھی گزرا جس میں یونان کی منطق اور فلسفہ نے عالمِ اسلام پر شدید حملہ کیا۔ ارسطو کی منطق کو ایسا قبول عام حاصل ہوا کہ اصل یہ ہی ہے۔ اصل میزان یہی ہے۔ جو شے اس میزان پر پوری اترے وہی قابلِ اعتبار ہے اور جو چیز اس کے معیار کے برابر نہیں وہ قابلِ ردّ ہے۔ ہر عمل کا ردّعمل ضرور ہوتا ہے‘ چنانچہ اس فکری گمراہی نے بھی نئے نئے مسائل کو جنم دیا‘ یعنی جبر و قدر اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں تشکیک و ریب جیسے گمبھیر مسائل نے سر اٹھایا۔ ؎

ہیں صفاتِ ذاتِ حق‘ حق سے جدا یا عینِ ذات؟
اُمّت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات!

اس فکری گمراہی کے برگ و بار پھوٹے‘ جنہوں نے الحاد کے نئے نئے فتنے تراشے۔ یعنی نہ کوئی خالق ہے نہ مخلوق اور نہ ہی کوئی مقصدِ تخلیق! اجزائے عناصر فضائے بسیط میں ازل سے بے مقصد بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ حسنِ اتفاق سے اگر انہیں متناسب ترتیب کا موقع ملا تو نئی شے پیدا ہو گئی۔ نئی اشیاء کو قرنوں بھٹکنے کے بعد کبھی اتفاقیہ موزوں ماحول اور متناسب قربت راس آئی تو حیات

پیدا ہوگئی۔ جب تک ماحول سازگار رہا' حیات کا مظاہرہ رہا۔ ماحول ناسازگار ہوگیا تو موت واقع ہوگئی۔ مقصد اور ارادے کا تصور انسان کی اپنی خوش فہمی ہے' حقیقت میں جب کوئی خالق ہی نہیں تو مقصد اور ارادے کی تلاش بے محل ہے۔

پھر یہ کہ انسان مجبورِ محض ہے یا پھر وہ اپنے اعمال پر پوری قدرت رکھتا ہے؟ وحی کی حقیقت کیا ہے؟ اس طرح کے مسائل نے عقیدہ اسلام میں دراڑیں ڈالنا شروع کردیں۔ ''افلاطونیت جدید'' کے عنوان سے ایک فلسفیانہ مکتب فکر سامنے آیا جو اخلاقیات' طبیعیات اور ریاضیات سے صرفِ نظر کر کے صرف مابعد الطبیعیات (Metaphysics) پر زور دیتا ہے۔ اس مکتبِ فکر کے نزدیک خدا ایک مکمل اور بے نیاز ہستی ہے جس کا ادراک (perception) ہمارے حواس نہیں کر سکتے۔ اس طرزِ فکر کی بڑی خامی یہ ہے کہ انسان کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کے مسائل کا کوئی مثبت حل پیش نہیں کرتا بلکہ اسے ترک کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ نوفلاطونیت (Neo-Platonism) کے زیر اثر ہی سب سے پہلے یونانی فلسفے میں تصوف کی آمیزش ہوئی اور توحید کا سادہ عقیدہ ''وحدت الوجود'' جیسے پیچیدہ مسئلے کا رنگ اختیار کر گیا۔ مامون الرشید کے زمانے میں جب مسلمان علماء نے یونانی کتابوں کا عربی ترجمہ کیا تو اسلامی لٹریچر میں اس طرز فکر کو فروغ ملا۔ ان پیچیدہ اور گمراہ کن مسائل کا توڑ کرنے کے لیے جن دو عظیم شخصیتوں کے نام آتے ہیں ان میں ایک امام غزالیؒ ہیں جنہوں نے ''تہافت الفلاسفہ'' جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھ کر اس باطل نظریے کی بیخ کنی کی۔ دوسری شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہؒ کی متبحر علمی شخصیت تھی جنہوں نے '' الرد علی المنطقیین '' تصنیف کر کے یونانی منطق کی نفی ان کے منطق ہی سے کر دی۔ یوں عالمِ اسلام ان یونانی مفکّرین کی علمی اور فکری گمراہی کے سحر سے آزاد ہوا۔

اس کے بعد اگلا دور تصوّف کا تھا' جس کے ساتھ تھوڑی بہت آمیزش '' ہمہ اوست'' (Pantheism) کی بھی تھی۔ تصوّف میں اصل معاملہ تو ''وحدت الوجود'' کا تھا مگر کچھ صوفیاء اس کی انتہا کو پہنچ گئے اور وہ ''ہمہ اوست'' تک جا پہنچے۔ اب چونکہ وحدت الوجود اور ہمہ اوست میں باریک سا فرق ہے جو عوام الناس کے فہم سے بالاتر ہے' اس لیے جب ان تک یہ پہنچا تو وہ وحدت الوجود نہ رہا بلکہ محض ہمہ اوست بن کر رہ گیا۔ چنانچہ اس کے منطقی نتیجہ کے طور پر ہمہ اوست کے عقیدے نے خالق و مخلوق کا فرق ہی ختم کر دیا۔ یعنی ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ ..... خود رندِ سبوکش

خود بر سرِ آں کوزہ خریدار برآمد..... بشکست و رواں شد!

الحاد تقریباً اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ ایمان۔ الحاد کی قدیم ترین شکلوں کو دینی اصطلاح میں شرک کا عنوان دیا گیا ہے۔ توحید اور شرک اس آئینہ میں جڑواں اصول رکھتے ہیں۔ شرک کی روایت خدا کو ماننے کی روایت نہیں' بلکہ نہ ماننے کا بہانہ ہے۔ الحاد کی قدیم ترین شکلیں اُس مربوط (organized) شرک کی صورت میں ظاہر ہوئیں جنہوں نے مظاہر کا عنوان اختیار کیا تو اساطیر (myths) کہلائیں۔ یہ اساطیر اپنی اساس میں الحاد کا تعمیر شدہ ڈھانچا (structure) ہیں' جس میں خدا ایک منفی حوالے کے ساتھ تو موجود ہے لیکن اپنے مثبت اقرار کی صورت میں غیر حاضر ہے۔ مشرک اپنے بنائے ہوئے معبودوں کے اختیار کو ماننے اور منوانے میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ اللہ کو ایک متروک حوالہ بنا کر اور اس میں سے الوہیت کے خصائص نکال کر اسے اپنے بنائے ہوئے معبود کی سپردگی میں دے دیتا ہے۔ بس یہی شرک ہے۔ دورِ قدیم کے اس الحاد کو ختم کرنے کے لیے ہی نبوت کا سلسلہ شروع ہوا۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب میں بگاڑ ہمیشہ وحی الٰہی میں تشکیک اور اس کے مقابلے میں عقل یا وجدان کے استعمال میں افراط و تفریط سے ہوا ہے۔ موقف کی غلطی یا اس کے اشتباہ سے سائنس کے میدان میں بھی غلط نتائج نکلتے ہیں جو دُور رس اور عظیم بھی ہو سکتے ہیں' تاہم یہ لازمی نہیں کہ سائنس دانوں کی اس غلطی کا خمیازہ کسی قوم کو ساری زندگی بھگتنا پڑے۔ البتہ اگر یہ غلطی خدا کے ہونے کے مسئلے میں ہو جائے تو اس کے نتائج کی ہولناکی کا اندازہ لگانا انسانی فہم سے بالاتر ہے۔ یہ زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے جس کے اثرات پوری حیاتِ انسانی پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں غلطی کا مطلب یہ ہے کہ پوری زندگی غلط اور گمراہی کی راہ پر چل پڑے۔ زندگی کا ہر شعبہ غلط رخ اختیار کر لے اور تمام تر مادی ترقی کے باوجود نوعِ انسانی ہلاکت و خسران کی بھینٹ چڑھ جائے۔ موجودہ دور میں ہم اسی طرح کی مصیبت و ہلاکت سے دوچار ہیں۔

آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں اس میں الحاد دین خدا کے لیے کوئی جگہ اور گنجائش نہ چھوڑنے کے لیے پوری قوت اور جاں فشانی کے ساتھ ڈٹا ہوا ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی دینِ

متین کے لیے کچھ حصّہ بچا ہوا تھا وہ علاقہ بھی اب الحاد کے زیر نگیں آ چکا ہے اور ہم بے دست و پا اس کے پھیلاؤ کو دیکھ رہے ہیں۔ کچھ کرنا ہمارے بس میں ہی نہیں رہا‘ کیونکہ بلاشبہ ہم مسلمان تو ہیں مگر اسلام ہمارے فکر و عمل میں محض ایک دھندلے تصوّر کی مانند ہو کر رہ گیا ہے۔

تاریخ میں اتنا بڑا چیلنج کبھی درپیش نہیں آیا جتنا وہ آج ہمارے سامنے الحاد کی صورت میں کھڑا ہے۔ ہمیں اس کی سنگینی کا ادراک ہونا چاہیے۔ اس دنیا میں عقل و تعقل کے لیے ایسے ایسے اسباب پیدا کر لیے گئے ہیں جن میں اللہ کو ماننے کی گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔ دنیا جن علوم و نظریات و تصوّرات پر چل رہی ہے ان کا مجموعی رخ اللہ سے مخالف سمت میں ہے۔ یہ نظام اپنے دلائل کی بنیاد پر اللہ کو نہ ماننے پر اکساتا ہے اور ایسے دلائل کو ایک ترتیب کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

آج دنیا کی زمام ملحدین کے ہاتھ میں ہے۔ وہ انکارِ خدا کی اساس پر پوری زندگی اور کل انسانی دنیا کی تعمیر کر رہے ہیں اور اسی پر بضد ہیں۔ اس غلط روش کے مہلک نتائج بھی نکل رہے ہیں۔ بادیٔ النظر میں ان کی روش کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان کے پاس خدا کے نہ ہونے کے قطعی دلائل ہوں گے‘ جبھی تو وہ اس عظیم ذمہ داری کو اپنے سر لے رہے ہیں اور قطعیت و وثوق کے ساتھ عالم انسانیت کو الحاد اور ملحدانہ زندگی اختیار کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ لیکن کیا حقیقت میں ایسا ہی ہے؟ تحقیق اور مطالعہ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔

منکرِ خدا کے تمام دلائل کا حاصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہیں خدا کے وجود کا علم نہیں ہے۔ وہ اپنے حواس یا عقل کی بنیاد پر خدا کو پا نہیں سکے ہیں۔ یہ موقف واضح طور پر ’’عدمِ علم‘‘ کا ہے‘ مگر انہوں نے ’’عدمِ علم‘‘ کو ہی ’’عدمِ وجود‘‘ کا مترادف سمجھ کر قطعیت کے ساتھ خدا کا انکار کر دیا۔ درحقیقت نہ جاننے کی صورت میں خدا کے نہ ہونے کا بھی اتنا ہی امکان تھا جتنا کہ اس کے ہونے کا‘ اس لیے کہ کسی چیز کا علم نہ ہونا ایک بات ہے اور اس کا وجود ہی نہ ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ ان کے درمیان فرق کرنا ہی علم کی اصل کلید ہے۔

اب صورت یہ ہے کہ دورِ جدید میں الحاد معاشرے کے نظام کو طے کرنے والی قوت بن چکا ہے۔ ملحدین کا سب سے بڑا علمی استدلال یہی ہے کہ ان کے انکارِ خدا کے موقف کو علمی تائید اور اخلاقی شہادت حاصل ہو۔ چنانچہ اگر ہم نے اس چیلنج کا سامنا تعلق باللہ کے ساتھ نہیں کیا تو ہماری

آئندہ نسلوں میں مسلمان ہونے کا امکان زیادہ نہیں رہے گا‘ کیونکہ اس دنیا میں علمی‘ اخلاقی سمیت ہر نظام کی تشکیل کرنے والا عملی نمونہ اب مغرب ہی ہے۔ بعض اپنے آپ کو مغرب زدہ کر چکے ہیں اور بعض اس کی لگن میں ہیں۔ صاحبِ ثروت لوگوں میں تو پہلے ہی الحاد کا وائرس داخل ہو چکا ہے۔

اس چشم کشا حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کفر اب جدید فلسفیانہ تصوّرات سے مسلّح ہو کر اسلام پر حملہ آور ہو چکا ہے اور اس نے ملّت کی صفوں کو کسی قدر درہم برہم بھی کر دیا ہے۔ دنیا بھر میں ہمارے لاکھوں تعلیم یافتہ بھائی ہم سے چھینے جا چکے ہیں اور یہ عمل ہمہ وقت جاری ہے۔ یہ صورت حال ہماری قومی زندگی کے لیے شدید خطرہ ہے‘ لیکن افسوس کہ ہم اس کا احساس نہیں کرتے اور نہ اس کی روک تھام کے لیے کوئی مؤثر کارروائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ جب ہندوستان میں آریہ دھرم اور عیسائیت جیسے مذاہب نے اسلام کو للکارا تھا۔ اُس وقت عیسائی مشنریوں اور دیانندی ہندوؤں کی کوششوں سے ہندوستان بھر میں صرف چند پڑھے لکھے مسلمان ہی عیسائی یا آریہ بنے تھے‘ لیکن ہم نے شور بپا کر دیا تھا۔ تھوڑے عرصے ہی میں ایسے علماء کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آ گئی تھی جنہوں نے کتابوں‘ رسالوں‘ اخباروں‘ وعظوں‘ جلسوں اور مناظروں کے ذریعہ سے مخالفین اسلام کی پے در پے مؤثر تردید کی تھی۔ ان علماء نے آریہ دھرم اور عیسائیت کے مآخذ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان پر سنگین اعتراضات وارد کیے اور جو اعتراضات ان کی طرف سے اسلام پر وارد ہوتے تھے ان کا مسکت جواب مہیّا کیا‘ یہاں تک کہ غیروں کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ مذاہب کی اس جنگ میں اسلام کا پلڑا بھاری رہا۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کی ارتداد کا فتنہ رک گیا۔

کسی عقیدے میں حق کا فہم بالکل ایک نہیں ہو سکتا۔ ہر مذہب میں ایسے انحراف ضرور رونما ہوتے ہیں جنہیں معتقدین کی بڑی جماعت گمراہی سے تعبیر کرتی ہے۔ جب تک انسانی تفکّر میں انفرادی رنگ باقی ہے‘ تمام نظام اپنے باغی اور منحرف پیدا کرتے رہیں گے۔ جب کوئی مذہب ایک ایسے وسیع علاقے پر پھیل جاتا ہے جو ثقافت اور فلسفے کی روایات سے معمور ہوتا ہے‘ جیسا کہ اسلام نے ایک قلیل مدّت میں کیا‘ تو وہ گزشتہ عقیدوں کے تمام آثار و علامات کو مٹا نہیں سکتا۔ مصر‘ ایشائے کوچک‘ ایران اور وسط ایشیا کا رابطہ جب اسلام سے قائم ہوا تو ان کی اپنی تہذیبیں ایک طویل تاریخ رکھتی تھیں۔ چنانچہ ان ممالک میں پہلے دن سے اسلام کو افکار کے ایسے مجموعے سے

واسطہ پڑا جسے اس کو مسترد‘ برداشت یا جذب کرنا تھا۔ استرداد (veto) ایک شعوری عمل ہوتا ہے‘ جس میں معائنہ اور تشخیص مضمر ہوتی ہے‘ مگر انجذاب (absorption) ہمیشہ شعوری نہیں ہوتا۔ یہ زیادہ تر تحت الشعوری ہوتا ہے اور نئے تصوّرات تنقید کی کسوٹی پر آئے بغیر ہی ہمارے عقائد میں داخل ہو جاتے ہیں۔

الحاد ایک سوچ اور فکر کا نام ہے۔ اس فکر کے حاملین بہت سمجھ داری سے کام کر رہے ہیں۔ وہ ایک مسلمان کو نماز‘ روزے اور دیگر مذہبی رسوم پر عمل کرنے سے منع نہیں کرتے‘ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اچھے انسان کہلاؤ اور پھر کسی مذہب کی بجائے انسانیت کی سوچ کے ساتھ زندگی گزارو۔ انسانی اقدار کی تبلیغ کرو!

سرسیّد احمد خان نے جب رسالہ ’’تہذیب الاخلاق‘‘ نکالا تو اُس وقت یورپ میں یہ خیال عام تھا کہ مذہب یا تو ایک غیر ضروری چیز ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کا مقصد انسانی اخلاق کو درست کرنا ہے۔ چنانچہ مذہب میں اولین اہمیت اخلاق کی ہونے لگی۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں کے ذریعے جو نئے خیالات ہمارے ہاں رائج ہوئے ان کا مرکزی نکتہ بھی یہی تھا کہ مذہب کا مقصد و منتہا صرف اخلاقی اعتبار سے اچھے لوگ پیدا کرنا ہے۔ انسان اتنی پیچیدہ اور گہری حقیقت ہے کہ اس کو صرف اخلاقی پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ اس فکر سے مذہب میں جو ضعف پیدا ہوا وہ آج تک اُمّتِ مُسلمہ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

فرائیڈ نے تو کہا ہے کہ بنیادی جبلتیں دو ہیں: ایک تحفظ ذات اور دوسرا تحفظ نسل۔ گویا بھوک اور جنس انسان کے بنیادی محرکاتِ عمل ہیں۔ ایک حیاتی وجود کے طور پر اسے ان جبلتوں کی تسکین کے سوا اور کسی چیز سے غرض نہیں ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل خود شعوری (self-conscious) ہوتا ہے‘ جسم کا عمل نہیں ہوتا۔ خود شعوری جسم کو اپنے عمل کے لیے ذریعہ یا وسیلہ کے طور پر کام میں لاتی ہے۔ لہٰذا ہر عمل بالآخر ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے‘ جو انسان کو محبوبِ حقیقی کے قریب لاتی ہے یا اس سے دور کرتی ہے۔ چنانچہ وہ بِالقُوّہ (potentially) راحت کی حامل ہوتی ہے یا رنج کی‘ جنّت ہوتی ہے یا دوزخ!

تقلید انسان کی فطرت کا خاصّہ ہے۔ انسان اکثر لاشعوری طور پر دوسروں کے خیالات اور نظریات اپنا لیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ﴾ (الممتحنۃ:۱)

’’اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ‘ کیا تم انہیں محبّت کی پیش کش کرو گے جب کہ وہ اس حق کو جھٹلا چکے ہیں جو تمہارے پاس آیا ہے!‘‘

مزید ارشاد فرمایا:

﴿اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝۲﴾ (الممتحنۃ)

’’اگر یہ لوگ تم پر قابو پا لیں تو تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور تمہیں ایذا پہنچانے کے لیے اپنے ہاتھ اور زبانیں تمہاری جانب بڑھائیں گے‘ اور وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم کافر ہو جاؤ۔‘‘

صوفیاء کا قول ہے کہ ’’مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ‘‘ یعنی خود شناسی میں خدا شناسی ہے۔ جتنا جس نے خود کو جانا‘ اتنا ہی اپنے ربّ کو جانا۔ اگر ہمارا وجود خدا کی ذاتی ہوتا تو ہم کو لازم رہتا‘ کیونکہ ذات سے ذاتیات اجسادِ منفک نہیں ہو سکتے۔ ہم بین العدمین ہیں‘ یعنی دو عدم کے درمیان۔ پہلے بھی ہم معدوم تھے اور چند روز‘ مہینوں‘ سالوں بعد پھر معدوم ہوں گے۔ اگرچہ ہمارا معدوم ہونا جسمانی اعتبار سے ہے‘ ورنہ انسان روحانی حیثیت سے تو کبھی معدوم ہوتا ہی نہیں۔ اس عالَم میں آنکھ بند ہوئی اور دوسرے عالَم میں آنکھ کھلی۔ روح کا سفر تو جاری رہتا ہے۔

انسانی روح میں تخیل کی قوت بھی ہوتی ہے۔ انسان کی روحِ حیوانی (Animal Soul) جسم کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے‘ لیکن روحِ عقلی (Rational Soul) ازلی اور ابدی ہے۔ اس کی کیفیات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی‘ اور یہ جسم کی موت سے متاثر نہیں ہوتی۔ روح ادراک کے ذریعے سے محسوس اشیاء کا علم حاصل کرتی ہے اور عقل کے ذریعے سے تصوّرات قائم کرتی ہے۔ فرد کے اندر فکر ہمیشہ حسّی تماثیل کے ساتھ ہوتا ہے۔ ارسطو دو قسم کی عقلوں میں امتیاز قائم کرتا ہے۔ ایک فعلی (active) اور دوسری انفعالی (passive)۔ ایک وہ جو سب کچھ کرتی ہے اور دوسری وہ جس پر سب کچھ وارد ہوتا ہے۔ ادراک (perception)‘ تخیل (imagination) اور حافظہ (memory) کا تعلق جسم سے ہے‘ اس لیے اس کے ساتھ ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ انفعالی عقل جسم کے ساتھ پیدا ہوتی ہے‘ لیکن فعلی عقل ازلی اور ابدی ہے۔ یہ جسم اور انفعالی عقل سے پہلے ہی موجود تھی۔ یہ بالکل غیر مادی اور ناقابلِ فنا ہے۔

فعلی عقل خدائی ذہن کی ایک چنگاری ہے جو خارج سے روح میں آتی ہے۔

دین سے لاعلم لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ حق یا صداقت کوئی مطلق یا مستقل چیز نہیں' بلکہ اضافی چیز ہے جو ہر فرد اور زمان و مکان کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے انسانی ذہن کی معراج معرفت یا علم کا حصول نہیں بلکہ تشکیک ہے۔ سب سے عقل مند آدمی وہ ہے جو ہر چیز اور ہر خیال کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔ تشکیک کا یہ فلسفہ موجودہ مغربی ذہن کا لازمی جزو بن گیا ہے' جس کا آخری نتیجہ مادی ضروریات اور نفسانی خواہشات کی تسکین کے سوا ہر چیز سے مکمل بے نیازی ہے۔

مغرب کی ایک فکری گمراہی یہ بھی ہے کہ ان کی کوشش ہے کہ خدا کے اقرار یا انکار کے مسئلے کو ختم ہی کر دیا جائے۔ یہ فلسفہ انگلستان سے شروع ہوا ہے' اور وہاں اس کا نام ''منطقی ایجابیت'' (Logical Positivism) ہے۔ اب تک ہر زمانے میں یہ مسلمہ امر رہا ہے کہ جملے کے تین لازمی اجزاء ہوتے ہیں: اسم' فعل اور حرف۔ یہ بات بھی طے شدہ رہی ہے کہ اسم کسی چیز کے نام پر دلالت کرتا ہے۔ مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسم چیز پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ ہر لفظ اور جملہ کسی مخصوص حالت (situation) میں بولا جاتا ہے۔ چنانچہ جملے میں معنی ڈھونڈنے کے بجائے پہلے ہمیں اس حالت کا تجزیہ کرنا چاہیے جس میں یہ جملہ بولا گیا ہے۔ اس قسم کے تجزیے سے لوگ ثابت کرتے ہیں کہ روح کے بارے میں جتنے جملے بھی بولے جاتے ہیں وہ نہ سچے ہیں نہ جھوٹے' بلکہ بے معنی ہیں۔ گمراہی اور دہریت کی جتنی شکلیں یورپ میں موجود ہیں' وہ ہمارے ہاں مسلمانوں میں بھی اتنی عام ہو چکی ہیں کہ اس کی سینکڑوں مثالیں اور شہادتیں روزانہ اخبارات و جرائد میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اصول یہ ہے کہ کسی بھی دعویٰ یا موقف کو ماننا اور تسلیم کرنا ٹھوس دلائل کے ساتھ مشروط ہے۔ کسی بھی دعویٰ یا اظہارِ رائے کو محض اس لیے نہیں قبول نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ماننے والے یا اس پر عمل کرنے والے کثیر تعداد میں ہیں۔ خود قرآن حکیم میں اس طرزِ عمل کی مذمت کی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝۱۱۶﴾ (الانعام)

''اور اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کے پیچھے چلو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے

سے گمراہ کر ڈالیں گے۔ وہ تو وہم و گمان کے سوا کسی چیز کے پیچھے نہیں چلتے' اور ان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ خیالی اندازے لگاتے رہیں۔''

چنانچہ اکثریت کے موقف یا دعوے کو ماننے کے لیے معقول دلائل لازمی ہیں۔ قرآن جب کوئی دعویٰ کرتا ہے تو اس کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس اور معقول دلیل پیش کرتا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم میں ارشاد ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے)۔ اس کی دلیل میں ارشاد ہوا:

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ﴾ (الانبیاء: ۲۲)

''اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے۔''

قرآن حکیم کی آیاتِ بینات گمراہ انسانوں کی مسخ شدہ ذہنیتوں اور گرد آلود قلوب و اذہان کو صیقل کرنے کے لیے نازل کی گئی ہیں' اس لیے کہ قرآن کا تو موضوع ہی انسان ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ﴾ (الانبیاء: ۱۰)

''ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب اتاری ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے۔ کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے؟''

حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کو نہیں سمجھتا اور نہ اپنے ربّ کو۔ وہ محض ایک غلط خیال کے سبب اپنے ربّ کے متعلق ایک عقیدہ گڑھ لیتا ہے' حالانکہ اُس کا ربّ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ جب روزِ قیامت حجاب اُٹھ جائے گا تو اُس کا ربّ اُس کے عقیدے کے مطابق نہ نکلے گا' لہٰذا اُس کی مدد نہ کرے گا' کیونکہ دنیا میں اس شخص نے اپنے حقیقی ربّ کی عبادت نہیں کی۔ یہی کشمکش عذاب کا سبب ہوگی اور تمام عمر کی نادانی دائمی عذاب کا موجب بنے گی۔

''اللہ'' اسمِ ذات ہے' لہٰذا اس کا کوئی مدّ مقابل نہیں' کوئی مظہر نہیں۔ وہ وجودِ محض ہے' اس کے مقابل عدم ہے۔ لہٰذا ذات ہمیشہ باطن میں رہے گی' صفات ظاہر ہوتی ہیں۔ الٰہ بمعنی معبود ہے' لہٰذا اس کے مقابل عبد ہے۔ ربّ کے مقابل مربوب ہے' خالق کے مقابل مخلوق ہے اور غنی کے مقابل فقیر ہے۔

وہ تمام اشیاء یعنی انسان' حیات اور کائنات' جن کا عقل ادراک کرتی ہے محدود' عاجز' ناقص اور محتاج الی الغیر ہیں۔ مثلاً انسان بھی محدود ہے' کیونکہ وہ ہر شے میں ایک حد تک ہی نشوونما پاتا ہے اور اس سے آگے تجاوز نہیں کرتا۔ حیات بھی محدود ہے' کیونکہ اس کا مظہر فقط انفرادی ہے اور

حیات سے اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ حیات آخر کار افراد ہی پر جا کر منتہی ہوتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ پوری کائنات ہی محدود ہے۔ جب ہم محدود پر نظر ڈالتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ ازلی نہیں ہوسکتا' کیونکہ اگر وہ ازلی ہوتا تو محدود نہ ہوتا۔ اس محدود کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ کسی اور کی مخلوق ہو' اور یہ وہی ہے جو کہ انسان' حیات اور کائنات کا خالق ہے۔ پس یہ خالق یا تو کسی غیر کی مخلوق ہوگا' یا وہ خود خالق ہوگا' یا وہ ازلی واجب الوجود ہوگا۔

ہر وہ انسان جس کے پاس عقل ہے وہ اس امر کا ادراک کرسکتا ہے کہ ہر شے کا ایک خالق ہے جس نے اسے خلق کیا ہے' کیونکہ تمام اشیاء ناقص' عاجز اور غیر کی محتاج ہیں۔ پس یہ قطعی طور پر مخلوق ہیں۔ اس سے انسان کو اللہ تعالیٰ کے وجود کا قطعی ادراک ہوسکتا ہے جو کہ خالق و مدبر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝۱۹۰ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (آلِ عمران: ۱۹۱)

''بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے باری باری آنے جانے میں ان عقل مندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں' جو اٹھتے بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں۔''

اور اس طرح سورۃ الروم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ۝۲۲﴾

''اور اُس کی نشانیوں کا ایک حصہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ یقیناً اس میں دانش مندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔''

ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ ۝۱۷ وَاِلَی السَّمَآءِ كَیْفَ رُفِعَتْ ۝۱۸ وَاِلَی الْجِبَالِ كَیْفَ نُصِبَتْ ۝۱۹ وَاِلَی الْاَرْضِ كَیْفَ سُطِحَتْ ۝۲۰﴾ (الغاشیۃ)

''تو کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے پیدا کیا گیا؟ اور آسمان کو کہ اسے کس

طرح بلند کیا گیا؟ اور پہاڑوں کو کہ انہیں کس طرح گاڑا گیا؟ اور زمین کو کہ اسے کیسے بچھایا گیا؟''

انسان کی تخلیق کی ابتدا کہاں سے کی گئی ہے' اس کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝۵ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝۶ یَّخْرُجُ مِنْۢ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝۷﴾ (الطارق)

''پس انسان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اُسے کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ اسے ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے' جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔''

اب یہ وہ نشانیاں ہیں جو انسان کے لیے آفاق و انفس سے ہویدا ہیں۔ ان سب چیزوں کا مشاہدہ کر کے بھی اگر انسان کی آنکھیں نہ کھلیں تو اس کی حالت پر کف افسوس ہی ملا جاسکتا ہے۔ اللہ کی بندگی اور فرماں برداری سے انسان کو جو کمال اور قدرت حاصل ہوتی ہے اس کے کئی مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جس میں انسان اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے اور اس کے اندر ایک ایسی بصیرت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو واضح طور پر دیکھنے لگتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا....﴾

(الانفال: ۲۹)

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے ساتھ تقویٰ کی روش اختیار کرو گے تو وہ تمہیں (حق و باطل کی) تمیز عطا کردے گا....''

اور مزید فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: ۶۹)

''اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی' ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے۔ اور یقیناً اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی بندگی کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ نفسِ امّارہ پر غلبہ حاصل ہوجاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قوتِ متخیلہ یعنی پراگندہ خیالات پر قابو پانے کی استعداد حاصل ہوجاتی ہے۔ ہماری قوتوں میں قوتِ متخیلہ سب سے عجیب ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارا دماغ ہر لحظہ ہماری توجہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب منتقل کرتا رہتا ہے۔ یہ قوت ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ رسول مکرم ﷺ نے اس حوالے سے فرمایا:

''انسان کے دل میں ایک ابلتی ہوئی دیگ سے بھی زیادہ ہیجان ہوتا ہے۔'' (مسندِ احمد)

انسان کو چاہیے کہ اپنے خیالات کی پرواز کو قابو میں رکھے‘ ورنہ شیطانی قوت اُس کی ہر استعداد کو تباہ و برباد کردے گی‘ اُسے قربِ الٰہی سے دور کردے گی اور انسان میں موجود تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو ضائع کردے گی۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے:

''اگر انسان ہر وقت اپنے آرام‘ تکلیف اور نفع و نقصان کے خیالات میں غرق رہے تو وہ سکونِ قلب کھو دیتا ہے اور عالمِ بالا میں پرواز کے قابل نہیں رہتا۔''

الحاد و تشکیک کی شروعات انسانی قلوب و اذہان میں کسی وقتی حادثے کا نتیجہ نہیں ہوتیں‘ بلکہ یہ انسان کے تحت الشعور میں غیر محسوس طریقے سے داخل ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ انسان کی فکری سطح پر زنگ کی طرح پھیل جاتا ہے‘ اور روحِ انسان پر اس کا تسلّط قائم ہوجاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر توحید کے حوالے سے انسان کی عملی اور فکری قوت مضمحل ہونے لگتی ہے اور پھر طرح طرح کے زیغ و ضلال کی ایک دنیا دل میں گھر کر لیتی ہے۔ نفس اور روح کی مکمل تطہیر اُس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک انسان ان تمام خواہشات‘ تمنّاؤں اور افعال سے اجتناب نہیں کر لیتا جو اس کی فطرتِ سلیمہ اور عبدیت کے خلاف ہیں۔

کتابیات

(۱) آسان ترجمہ قرآن‘ مفتی محمد تقی عثمانی
(۲) برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ‘ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
(۳) فصُوص الحِکم‘ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی
(۴) تاریخ تصوّف‘ علامہ محمد اقبال
(۵) جدیدیت‘ حسن عسکری
(۶) فلسفہ ولایت‘ مرتضیٰ مطہری
(۷) عہدِ حاضر میں الحاد و تشکیک‘ احمد جاوید
(۸) نظریۂ وحدت الوجود اور ڈاکٹر اسرار احمد‘ حافظ محمد زبیر

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

اسلامی تعلیمات میں اخلاق کی اہمیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام وہ کامل اور جامع دین ہے جس میں انسانی زندگی میں پیش آنے والی ہر قسم کی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے راہنمائی موجود ہے۔ خوشی کا موقع ہو تو کیسے گزارا جائے؟ کوئی غم واندوہ درآئے' انسان بیمار ہو جائے یا کوئی سانحہ پیش آ جائے تو کیسا طرزِ عمل ہونا چاہیے؟ یہ تو کبھی کبھار پیش آنے والے واقعات ہیں۔ اسلام میں تو ان روزمرہ معاملات کے متعلق بھی راہنمائی ملتی ہے جو ہر کسی کو پیش آتے ہیں۔ اس پر بعض نافہم لوگوں نے اعتراض کیا کہ کیسا مذہب ہے کہ معمولی معمولی باتوں کا بھی ذکر کرتا ہے! تو ان کا جواب یہ ہے کہ یہی تو اسلام کی انفرادیت' جامعیت اور اکملیت ہے کہ یہ کسی چھوٹے مسئلے سے بھی چشم پوشی نہیں کرتا۔ دین اسلام کے ماننے والے کو اگر کوئی معمولی مسئلہ درپیش ہو تو اسے حل کرنے کے لیے کہیں اور سے راہنمائی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسا دین ہے کہ اس میں ہر طرح کی پاکیزگی حاصل کرنے اور اخلاقیات کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔

رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل کیا جو تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ اس کی تعلیمات پر منشائے الٰہی کے مطابق خود رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا۔ آپؐ کا زندگی گزارنے کا انداز اس قدر صاف شفاف اور واضح تھا کہ اسے پورے انسانوں کے لیے نمونہ قرار دیا گیا۔ اگر لوگ ایسا کریں تو دنیا کی زندگی جنّت نظیر ہو جائے اور ہر طرف عدل وانصاف اور امن چین ہی ہو۔ لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار ہو جائیں۔ اگر کوئی ضرورت مند ہو تو خوشحال اس کی مدد کریں۔ بیمار ہو تو اس کی تیمارداری کریں۔ گویا اسلامی طرزِ معاشرت میں نہ خودغرضی ہے نہ تکبر۔ دولت مندوں کو حکم ہے کہ وہ ناداروں کی ضرورت پوری کریں اور غریبوں' مسکینوں' بیماروں اور مصیبت زدوں کی مشکلات کا احساس کرتے ہوئے ان کی مدد کریں۔

چونکہ اسلام کی تعلیمات ہر زمانے کے انسانوں کے لیے ہیں' اس لیے ایک تو قرآن مجید کو ہر قسم کے ردّوبدل سے محفوظ کر دیا گیا اور وہ قیامت تک کے لیے ویسا ہی رہے گا جیسا وہ لوحِ محفوظ میں تھا۔ پھر چونکہ آپ ﷺ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا تھا اس لیے آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو بھی محفوظ کر دیا گیا اور آدم کے ہر بیٹے کو آپؐ کی راہنمائی میں زندگی گزارنے کا حکم دیا گیا۔ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ تو مالک کائنات نے خود لیا' لہٰذا اس سلسلے میں تو کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں' اور پھر یہ مشاہدہ بھی اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ صدیاں گزر گئیں مگر قرآن مجید میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور یہ قیامت تک مشیت خداوندی کے تحت غیر متبدل ہی رہے گا۔ یہ حقیقت غیر مسلموں پر بھی واضح ہو چکی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی گزار کر چلے جانا تھا' لہٰذا ضروری تھا کہ آپؐ کی زبان سے ادا کی گئی باتیں بھی محفوظ رہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپؐ کی تعلیمات آج بھی صحیح سالم موجود ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن کی حفاظت تو اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کے تحت ہو رہی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی حفاظت انسانوں ہی سے کرائی جائے۔ اور یہ ضروری بھی تھا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی زندگی کو تمام انسانوں کے لیے یہ کہہ کر نمونہ قرار دیا تھا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱) ''بے شک تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے''۔ لہٰذا لازم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو بھی محفوظ کر دیا جاتا۔ چنانچہ آپؐ کے فرمودات آج بھی لوگوں کی راہنمائی کے لیے من وعن موجود ہیں اور قیامت تک محفوظ رہیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دینے کا کوئی جواز نہ تھا۔ آپؐ کی دی ہوئی تعلیمات احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ سارا کام بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ کرنے والے خصوصی صلاحیتوں کے مالک انسان ہی تھے۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید کی تعلیمات پر بھرپور عمل کیا۔ اس طرح خالق کائنات کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے والے آپؐ انسانِ کامل تھے۔ ایک انسان کے لیے خوبیوں کی بلندترین چوٹی تک پہنچنا اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں ہی ممکن ہے۔

حسنِ اخلاق ایک انسان کا زیور ہے۔ لوگوں کو اخلاقی خوبیوں کے ساتھ مزیّن کرنا آپؐ کی تعلیم تھی۔ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ)) (موطا مالک) ''مجھے تو حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے''۔ آپؐ معلم اخلاق تھے۔ اپنے کردار و

عمل سے بھی لوگوں کو اسی کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن مومن کی میزانِ عمل میں سب سے زیادہ وزنی اور بھاری چیز جو رکھی جائے گی وہ اس کے اچھے اخلاق ہوں گے۔'' (ابوداؤد، ترمذی) اچھے اخلاق کی وضاحت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (صحيح البخارى)

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔''

مزید فرمایا:

''مؤمن وہ ہے جس کی طرف سے اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں لوگوں کو کوئی خطرہ نہ ہو۔'' (ترمذی عن ابی ہریرہؓ)

دین اسلام اسم بامسمّٰی ہے۔ جس نے اس کو قبول کرلیا اور اس کی تعلیمات پر عمل کر کے زندگی گزاری وہ دنیا میں بھی امن وسکون پائے گا اور اس کی آخرت کی زندگی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سکھ کی زندگی ہوگی۔ جو اسلام قبول کر لیتا ہے وہ مسلم ہے، یعنی لوگوں کے ساتھ سلامتی کا سلوک کرنے والا ہے۔ اسی طرح اسلام قبول کرنے والا مومن ہے یعنی وہ امن میں آجاتا ہے۔

اسلام کو اگر دینِ اخلاق کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔ اخلاق نام ہے خوبصورت سیرت وکردار کا۔ یعنی مسلمان ہر کسی کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آئے۔ وہ صرف وہی کام انجام دے جس کے کرنے کا اللہ حکم دے اور اس کام سے باز رہے جس سے پروردگار نے روکا ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے کے مطابق زندگی گزارے۔ اگر ایسا ہوگا تو وہ نہ صرف بنی نوع انسان کے لیے رحمت ہوگا بلکہ وہ حیوانوں پر بھی ترس کھانے والا ہوگا۔ مسلمان سے صرف یہی توقع نہیں کی جاتی کہ وہ خود اسلامی احکام کی پابندی کرے بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ کا یہ پسندیدہ دین لوگوں میں بھی پھیلائے۔ یعنی بھلائیوں کو پھیلائے اور برائیوں کے مٹانے میں لگا رہے۔ درحقیقت اسی کا نام اخلاق ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا)) (رواه الترمذى)

''مؤمنوں میں سب سے کامل ایمان اس کا ہے جو سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہو۔''

جوں جوں کوئی مسلمان اپنے اخلاق کو سنوارے گا، جنّت کے قریب ہوتا جائے گا۔ قیامت کا دن فیصلے کا دن ہوگا۔ انسان کی نیکیاں اور بُرائیاں تولی جائیں گی، جس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی،

اسے جنّت ملے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اچھے اخلاق والا اپنے حسنِ اخلاق کے باعث روزہ دار اور نمازی کے درجے کو پالیتا ہے۔'' (ترمذی عن ابودرداؓ) بااخلاق وہ ہوتا ہے جس کا رویہ لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ اور محبت کا ہو۔ وہ ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہو اور کسی کو اس کے رویے سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

حضرت انس اور عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ، وَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ))

(مشكاة المصابيح)

''مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور وہ شخص اللہ کو محبوب ہے جو اُس کے عیال سے اچھا سلوک کرتا ہے۔''

اچھا اخلاق صرف انسانوں کے ساتھ ہی مطلوب نہیں بلکہ دیگر مخلوق چرند پرند بھی اس کے حق دار ہیں کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، سختی نہ کی جائے۔ دوسروں پر رحم کرنے والوں پر تو اللہ بھی رحم کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''رحم کرنے والوں اور ترس کھانے والوں پر بڑی رحمت والا خدا رحم کرے گا۔ زمین پر رہنے بسنے والی مخلوق پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔'' (جامع ترمذی عن عبداللہ بن عمروؓ) اللہ کی مخلوق پر رحم کرنا اخلاقیات کا ایک اہم شعبہ ہے۔ بخاری اور مسلم کی متفقہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت سے محروم رہیں گے جن کے دلوں میں دوسرے آدمیوں کے لیے رحم نہیں اور جو دوسروں پر ترس نہیں کھاتے۔'' (عن جریر بن عبداللہؓ) مسلمان کی یہ شان نہیں کہ کسی دوسرے کو مشکل، مصیبت اور پریشانی میں دیکھے تو اس کی مدد نہ کرے۔ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کا حق سب سے فائق ہے۔ اس کے بعد ہمسایہ ہے۔ ہمسائے کے ساتھ تو ہر وقت کا تعلق ہوتا ہے، لہٰذا اس کی ضروریات کا احساس کرنا اور اسے ہر ممکن سہولت بہم پہنچانا ضروری ہے۔ اس معاملے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جبریلؑ پڑوسی کے حق میں مجھے برابر وصیت کرتے رہے اور تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اس کو وراثت میں بھی حق دار قرار دے دیں گے۔'' (صحیحین عن عائشہؓ وابن عمرؓ) آپؐ نے یہاں تک فرمایا کہ وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا جو ایسی حالت میں پیٹ بھر کر سو جائے کہ اس کے برابر رہنے والا اس کا

پڑوسی بھوکا ہو اور اس آدمی کو اس کے بھوکے ہونے کی خبر ہو۔(شعب الایمان للبیھقی) یہ ذکر ہے ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا۔ مسلمان کے لیے لازم ہے کہ ہر کسی کے ساتھ اس کا رویہ اچھے اخلاق کا ہو۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اچھا رویہ رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ))

(متفق علیہ)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے' کوئی بندہ سچا مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہو۔''

مسلمان کے ایمان کی نشانی ہی یہ ہے کہ وہ ہر کسی کے ساتھ بااخلاق رویہ رکھے' اور جس معاشرے میں وہ رہتا ہو وہاں کے لوگ اس کے اچھے اخلاق کی تعریف کرتے ہوں۔

❁❁❁

June 2021
Vol.70

Regd. CPL No.115
No.6

Monthly **Meesaq** Lahore

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وفاق المدارس سے الحاق شدہ

کُلّیۃُ القُرآن (قرآن کالج) لاہور

191۔ اتاترک بلاک۔ نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے ہیں اور دوسروں کو قرآن سکھاتے ہیں۔'' (حدیث نبوی ﷺ)

درس نظامی کے ساتھ ساتھ میٹرک (آرٹس سائنس)۔ ایف اے۔ بی اے اور ایم اے کے خواہش مند طلبہ کے لیے تمام درجات (ثانویہ عامہ۔ ثانویہ خاصہ۔ عالیہ اور عالمیہ) میں

داخلے شروع

اہلیت برائے داخلہ

☆ برائے درجہ ثانویہ عامہ (اولیٰ) آٹھویں جماعت پاس۔ میٹرک پاس کو ترجیح دی جائے گی۔
☆ برائے درجہ ثانویہ خاصہ (ثالثہ۔ رابعہ) میٹرک مع ثانیہ پاس۔
☆ برائے درجہ عالیہ (خامسہ۔ سادسہ) ایف اے مع رابعہ پاس۔
☆ برائے درجہ عالمیہ (موقوف علیہ۔ دورۂ حدیث) بی اے مع سادسہ پاس۔

شیڈول برائے داخلہ

☆ داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ 14 جون 2021ء
☆ انٹرویو اور تحریری ٹیسٹ 14 جون 2021ء
☆ کلاسز کا آغاز 15 جون 2021ء

خصوصیات

☆ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم لازمی
☆ حفاظ۔ ذہین اور مستحق طلبہ کے لیے مراعات
☆ وفاق المدارس العربیہ اور لاہور بورڈ/پنجاب یونیورسٹی کا نصاب
☆ نمایاں پوزیشن لینے والے طلبہ کے لیے وظائف

برائے معلومات

دفتری اوقات کے دوران 042-35833637
دفتری اوقات کے بعد 0301-4882395

المعلن

حافظ عاطف وحید، مہتمم
ریاض اسماعیل، پرنسپل